محمد خالد اختر
چاکی واڑہ میں وصال
ناول
16.05.2019
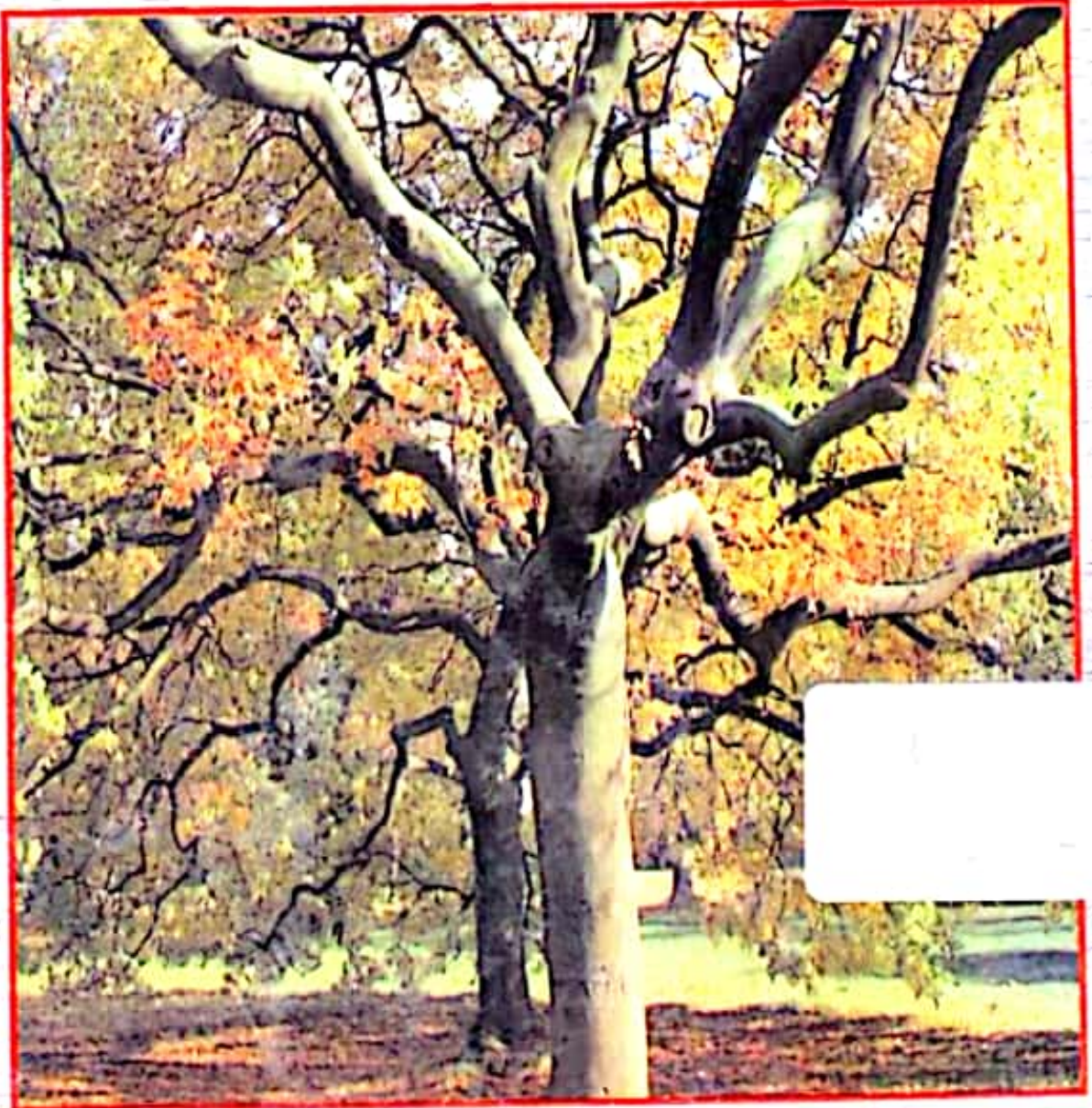
چاکی واڑہ میں وصال

محمد خالد اختر

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

891.4393 Muhammad Khalid Akhtar.
Chaaki warrah main visaal /
Muhammad Khalid Akhtar. - Lahore :
Sang-e-Meel Publications, 2000.
203 p.
1. Urdu Adab - Novel.
I. Title.

2000.
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

Chowk Urdu Bazar Lahore, Pakistan. Phone 7667970

کمبائن پرنٹرز، لاہور

انتساب

میرے پیارے سینور ریاضنیو (ریاض الرحمٰن اسکوائر)!

تمہیں یاد ہوگا کہ اس فینٹسی کے لکھے جانے کے بعد اس کے مسودہ کو پڑھنے والے تم پہلے شخص تھے اور تم نے اس کی زبان اور املا۔ کو درست کرنے کی حتی المقدور کوشش کی تھی (افسوس، ایک ناممکن کام!) یہ نو دس سال پہلے کی بات ہے جب ہم میں میانہ عمری کی سنجیدگی اور شائستگی نہیں آئی تھی اور ہم جوانسان کی غیر ذمہ داری کے ساتھ بہت سی مہمل چیزوں پر ہنس سکتے تھے۔ نو سال کے عرصہ میں یہ مسودہ مختلف ناشروں کے ہاتھوں میں سے گزرا۔ اور تم یہ سن کر حیران ہوگے کہ یہ کتاب واقعی اس وقت زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہے۔ جب کہ میں آپ کو اس کا مصنف ہونے کی حیثیت سے تقریباً بھول چکا ہوں۔

جیسا کہ تم جانتے ہو، اس کتاب کو دو چیزوں نے انسپائر کیا۔ ایک چاکی واڑا کے شہر نے جہاں میں ایک دو سال بوہیمین زندگی گزارتا رہا اور دوسرے رابرٹ لوئی سٹیونسن نے یہ ناول۔ یا ناولا۔ چاکی واڑہ کی فضا کو سٹیونسن کے رنگ میں منتقل کرنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے۔ اس کا اصل اور حقیقی کردار چاکی واڑا ہے باقی انسانی کردار محض ضمنی ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کے نزدیک جیتے جاگتے کردار نہ ہوں لیکن میں یہ امید کرنے کی جرآت کرتا ہوں کہ ان میں ایک ووڈہاؤسین، قسم کی جلت پھرت اور زندگی ضرور ہے۔ سعادت حسن منٹو نے اس مسودے کو اپنے دماغی ہسپتال کے بستر میں پڑھا تھا اور اس نے اپنی مخصوص صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے مصنف کو بتایا کہ یہ ناول بالکل بکواس ہے۔ لیکن مجھے

اس بات کا فخر ہے کہ منٹو جیسے انسان نے مزاح اور NONSENSE کے تار و پود سے بُنے ہوئے اس نادر طنزیہ کو الف سے یے تک پڑھا کیا تمہیں یاد ہے ہمارے بی۔اے کے کورس میں ایک انگریزی نظم تھی، غالباً لی ہنٹ کی جینی نے مجھے چوما جب ہم ملے، وہ کچھ اس طرح تھی: جینی نے مجھے چوما جب ہم ملے۔ اپنی کرسی سے اُچھلتے ہوئے جس میں وہ بیٹھی تھی۔ یہ کہو کہ میں بوڑھا ہوں اکیلا، درماندہ اور نزار، جوانی اور محبت نے مجھے تج دیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو کہو کہ جینی نے مجھے چُوما۔،

اسی طرح تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ناول، ایک ناول کی بجائے بافت سازی کا کام ہے اس میں ہزاروں عیب ہیں، اس کے کردار حقیقت سے دُور، چوبی پتلے ہیں لیکن یہ بھی تو نہ بھولو کہ منٹو نے اسے بیماری کے بستر میں پڑھا تھا اور اسے اپنی ساری خامکاری کے باوجود کچھ عرصہ ایک عظیم فنکار (جو اب ہمارے درمیان نہیں ہے) کا دل پرچانے کا فخر حاصل ہے — اس لئے یہ کتاب اتنی بڑی نہیں ہو سکتی اور تمہیں اس سے منسوب ہونے پر شرمساری نہیں ہونی چاہیئے!

میں اس سے زیادہ نہیں لکھوں گا۔ میرے ناشر نے انتساب کے لئے صرف دو ہی صفحے خالی چھوڑے ہیں۔

تمہارا

خالد

تقریباً ہر شخص میں قدرت نے "ہیرو پرستی" کا مادہ ودیعت کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہر شخص کے اپنے خاص ہیرو ہوتے ہیں جنہیں وہ ایک زریں سی دُھند میں اپنے سے اُوپر اولمپیا کی بلندیوں پر بیٹھے ہوتے دیکھتا ہے۔ مثلاً میرے ایک دوست کار جو امپورٹ کنٹرول میں معمولی کلرک ہے، ہیرو اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ کئی بار اس کے ساتھ شام کو پُر رونق صدر میں سے گزرتے ہوئے اور منور دوکانوں میں حسین چہروں کو تکتے ہوئے مؤدبانہ لہجہ میں سامنے بشرٹ میں ایک گنجے بطخ نما انسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "یہ چودھری کریم الدین ہے ہمارا سپرنٹنڈنٹ، ساڑھے آٹھ سو تنخواہ پاتا ہے۔" میرا دوست یہ کہتے وقت ایک بچے کی طرح خوش اور مغرور ہوتا ہے جیسا کہ اس نے مجھے دنیا کا ایک آٹھواں عجوبہ دکھا دیا ہو۔ ایک عجوبہ جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ایجاد کیا ہو۔ چودھری کریم الدین میرے دوست کے لئے اولمپیا کا دیوتا ہے۔ اس کے نزدیک چودھری کریم الدین انسانی ترقی کی ایسی معراج پر پہنچ چکا ہے جہاں اس جیسے شخص کبھی پہنچنے کا خواب تک نہیں دیکھ سکتے۔ عموماً ہمارے ہیرو، ایسے لوگ ہوتے ہیں جو وہ کچھ بن چکے ہیں جو ہم بننا چاہتے تھے مگر جانتے ہیں کہ کبھی بھی نہ بن سکیں گے۔ مختلف لوگوں کا اپنے ہیروؤں کے بارے میں ردِعمل بھی مختلف ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ وہ ہیروؤں کو پُوجیں ہی۔ سی گریڈ کلرکوں میں ان کے ہیرو اکثر جذبۂ حسد پیدا کرتے ہیں۔ بظاہر وہ اپنے سپرنٹنڈنٹ اور افسروں کی محدود دُنیاوی کامیابی کا مضحکہ بھی اُڑا سکتے ہیں مگر ان کا دل حسد اور رشک کی ایک بھٹی ہوتا ہے۔ اس

کے باوجود وہ ان کے متعلق باتیں کرتے وقت پر ارادت انداز اختیار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پھر ایسے بھی آدمی ہیں جن کے ہیرو سیاسی لیڈر ہوتے ہیں (خواہ وہ بظاہر سیاسی لیڈروں کو کتنی ہی گالیاں کیوں نہ دیں) بعض آدمیوں کے ہیرو مذہبی قائد ہوتے ہیں، حُر پیر پگاڑو کو سب سے اونچا سمجھتے ہیں۔ دنیا کے نوے فیصدی آدمیوں کے ہیرو ان کے دفتر، بزنس وغیرہ کے مالکوں اور ڈائرکٹروں کو چھوڑ کے، وہ سیاسی لیڈر ہوتے ہیں جو حکومت کی گدّی پر متمکن ہوں اور اس "ہیرو پرستی" سے ہم میں سے بہترین تربیت یافتہ لوگ بھی نہیں بچ سکتے۔ ایک بادشاہ مجمع میں سے ہر کسی سے داد لے گا، خواہ وہ گدھا ہی کیوں نہ ہو اور شاید اس مادی اقتدار کی دنیا میں عوام کی یہ "دیوانگی" اور ہیرو پرستی دیوانگی ہی تو ہے، قابل درگزر ہے۔

میرے اپنے ہیرو ـــــ میرے حقیقی ہیرو۔ وہ لوگ ہیں جو کتابیں لکھتے ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کیسی کتابیں لکھتے ہیں (کیونکہ میں ان کی کتابوں کو کبھی نہیں پڑھوں گا۔ میں مصنفوں میں ان کو ترجیح دیتا ہوں جو ادیب شہیر یا مصور جذبات بن چکے ہیں اور اس لئے "ہیرو ورشپ" کے لئے موزوں ترین تسلیم کئے جا چکے ہیں، مگر ان ادبی شیروں کے علاوہ ہر وہ شخص جس نے کوئی کتاب لکھی ہو، خواہ وہ "پکی روٹی" کا مصنف ہی کیوں نہ ہو ـــ میرا ہیرو ہے، میرا اپنا سگا بھائی ہے۔ میں کتابیں لکھنے والوں کو فولاد کے کڑوں سے اپنے سینے سے چمٹانے اور ان کے ساتھ ابدی وفاداری کا حلف اُٹھانے تک کو تیار ہوں۔ میں ادبی لوگوں کو اس طرح جمع کرتا ہوں جس طرح بعض لوگ ٹکٹ جمع کرتے ہیں۔ میری آٹوگراف کتاب پر شیخ اے۔ ڈی۔ کھوکھر (مصنف ہُن مین تیلو نان پاوانگی۔ تے ڈانس گھر ان وچ جاوانگی) سے لے کر چودھری نرگس بغدادی (مصنف مشہور اسلامی تاریخی ناول "دغا باز نشتر" تک کے آٹوگراف ان کے اپنے ہاتھوں سے (اگرچہ میرے فونٹین پن کی سیاہی سے) رقم زدہ موجود ہیں اور میں اس آٹوگراف کتاب

کو دنیا کا سب سے بیش بہا خزانہ سمجھ کر ہمیشہ سینے کے ساتھ رکھتا ہوں۔

مجھے اپنے ہیروؤں کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان میں سے بیشتر اپنے لئے اور ملک کے لئے زیادہ مفید ہوتے اگر وہ اپنے یہ شاہکار نہ لکھتے میں سمجھتا ہوں کہ بولٹن مارکیٹ کے ٹرام اسٹیشن پہ بیٹھے ہوئے بوٹ پالش کرنے والے میرے ہیروؤں سے بہتر اور سوسائٹی کے لئے زیادہ سود مند کام کر رہے ہیں کیونکہ لوگوں کے میلے بدنما بوٹوں کو پالش سے چمکا کر آئینہ بنانا، ان کے دماغوں میں بدمذاقی کوٹ کر بھرنے سے کہیں شریف تر پیشہ ہے۔ یہ سمجھنے کے باوجود، اے ڈی کھوکھر اور چودھری نرگس بغدادی میرے 'ہیرو' ہیں۔ میرے نزدیک چھپے ہوئے لفظ میں ایک ایسا جادو ہے جس کی مزاحمت ناممکن ہے۔ جب مجھے بازار میں کوئی مصنف نظر آتا ہے تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ میں اس کو مسحور نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہوں، میں اُس کو اس طرح دبوچ لینا چاہتا ہوں جیسے ایک عاشق اپنی گمشدہ محبوبہ کو۔ آٹوگراف بک باہر آ جاتی ہے اور میں اسے ہاتھ میں لئے اس نامور شخص کی طرف فوراً لپکتا ہوں۔ ادبی لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس ملک میں ایک شخص کم از کم ایسا ہے جو ان کے لئے دیوانہ ہے۔ جب وہ اس تخمے میں ہوں کہ اپنا اگلا کھانا کس کے ہاں کھایا جائے تو وہ بے دھڑک میرا دروازہ کھٹکھٹا سکتے ہیں، یہاں ان کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جائے گا۔ کھانے کے علاوہ میں اپنی قمیصیں اور ٹائیاں بھی اُدھار دے دیتا ہوں۔ وہ یقین کریں کہ میرا باورچی بہت اچھا ہے۔ گھی کی گارنٹی ہوگی اور سگریٹ پیش کرنے کے معاملہ میں بھی زیادہ تنگ دلی سے کام نہیں لیا جائے گا۔ میرا پتہ یہ ہے "اللہ توکل بکری وریسٹوران نزد بس اڈہ چاکی واڑہ" ان کو وہ ناقابل ہضم اور ثقیل سالن اپنے اندر ڈالتے ہوئے دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوگی کہ بیان سے باہر ہے کیونکہ اسی پیٹ سے وہ میٹھے دردناک رومان اور ناول تخلیق ہوں گے جن کو پڑھنے والے رانوں کو اکیلے اپنے سینہ پہ پتھر باندھ کر پڑھیں گے۔ بل کی ادائیگی کا ذکر

"ختم نہیں کیا جائے گا، صرف میری آٹوگراف کتاب میں انہیں چار پانچ الفاظ کی تکلیف دی جائے گی مثلاً

"کھانا بے حد لذیذ تھا،" مچھلی ماہی گیری (دستخط)

"خداوند تعالیٰ مسٹر محمد اقبال مالک اللہ توکل بیکری کو جزائے خیر دے،" فرش لنگوری (دستخط) ——

اس قسم کے!

یہی ہیرو ورشپ، شیخ قربان علی کٹار سے میری پکی دوستی کی وجہ بنی اور گو بعد میں چند وجوہات کی بنا پر میں نے اس دوستی کو ختم کرنا چاہا اور شیخ کٹار کو اس کے ختم کرنے کے بارے میں کئی لطیف اور واضح اشارے بھی دیئے مگر یہ دوستی کم از کم شیخ کٹار کی طرف سے بدستور قائم ہے۔ وہ اس قسم کا شخص نہیں جو اپنے دوستوں کو آسانی سے چھوڑ دے، وہ دوست زندگی بھر کے لئے بناتا ہے.....

مگر اب مجھے اس کا مکمل تعارف کرانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کیونکہ وہی اس دردناک رومان کا ہیرو ہے اور میں بھی خود ایک عرصہ سے اس کے متعلق بعض بکھرے بکھرے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے بے تاب ہوں۔ خدا کرے یہ صفحات اُس کی نظر سے گزریں!

ادبی لحاظ سے تو شیخ قربان علی کنار کا تعارف غیر ضروری ہے۔ کس نے اس کے مشہور جاسوسی ناول "شریف ڈاکو"، "انسپکٹر شہباز خاں"، "بدمعاش حسینہ" نہیں پڑھے! کس نے اس کی بدولت اپنی راتوں کی نیندیں حرام نہیں کیں! یہ سچ ہے کہ موجودہ نسل کے نوجوانوں کے لئے وہ محض ایک نام ہے اور وہ اسے نہیں پڑھتے مگر دس سال پہلے بلا مبالغہ شیخ کنار کے ناولوں کی دھوم تھی اور ادبی دنیا میں اس کے نام کی دہائی! کتنوں کے لئے خاص کر فینسل بک ڈپو اسکول کے معتقدین کے نزدیک۔ شیخ قربان علی ہمارے ادب کا درخشاں ترین نام تھا۔ اور "سحر نگار"، "جادو رقم"، "شاہ اسرار"، وغیرہ کے القاب اکثر اس کے نام کے ساتھ لگائے جاتے تھے۔ ان دنوں کئی اردو کے رسائل کے ایڈیٹر سال کے شروع میں بننے سال کے سرکاری اعزاز کی تقلید میں مشہور ادیبوں کو خطابات سے نوازنے کے عادی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شیخ کنار ان دنوں اپنے شائقین اور پرستاروں کے دلوں میں اس درجہ عقیدت اور رغبت کے جذبات ابھارنے کا اہل تھا کہ وہ اس کا نام بصد ادب و احترام لفظ "حضرت" یا "علامہ" کے ساتھ لیتے اور اس کی کتابوں کے چھپنے کا بے صبری سے انتظار کرتے۔ اگرچہ شیخ کنار کی وہ مقبولیت اب نہیں رہی پھر بھی ایک مخصوص حلقے میں اس کی کتابیں اب تک پڑھی جاتی ہیں، اور مجھے اگلے روز یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ "بدمعاش حسینہ" ابھی تک ناولوں کی دوکانوں پر کتنی سبے۔ غالباً آٹھویں بار طبع ہو چکی ہے۔

قربان علی، بقول خود، اس وقت کوئی دس گیارہ سال کے عرصہ میں پچاس کے لگ بھگ ناول لکھ چکا ہے۔ جن میں سے بیشتر اب دستیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ تو وہ ناول ہیں جو اشاعت کے مرحلہ تک پہنچ سکے، ان ناولوں کی جو اس نے اپنے ایام طالب علمی میں لکھے تھے اور جن کے مسودوں سے، اس کے والد نے، انتقامی جذبات کے ماتحت اپنے حقہ کی چلمیں سلگانے کا کام لیا تھا، مجھے قربان علی نے پوری تعداد مہیا نہیں کی۔ ہاں وہ اب تک ان کے ضائع ہو جانے پر کفِ افسوس ملتا ہے اور مجھ سے اکثر کہتا رہتا ہے کہ اسے ان مسودوں کے ضائع ہونے کا اتنا دکھ نہیں جتنا اردو ادب کے اس عظیم نقصان پر جو ان کے زائل ہونے سے ادب کو پہنچا۔ "وہ میرے طبع شدہ ناولوں سے کہیں زیادہ سنسنی خیز اور موثر تھے"، یہ میں اس کی زبان سے کئی بار سن چکا ہوں۔

ان جاسوسی ناولوں کی تصنیف سے اُسے حیرت انگیز طور پر قلیل آمدنی ہوئی۔ قربان علی کوئی تیز طرار شخص نہیں بلکہ وہ بے حد سادہ لوح ہے۔ اس کو ٹھگنا ایک بچے کو ٹھگنے سے زیادہ آسان ہے۔ دس سال پہلے جب اس کی کتابیں بکتی تھیں اگر وہ تھوڑا سا بھی دُنیادارانہ طریق پر چوکس ہوتا تو رُوپوں کے جہاز کے جہاز کما سکتا تھا، مگر جیسا کہ میں نے کہا ہے اس میں کاروباری چالاکی نہ تھی اور اس کی بجائے اس کے پبلشر حاجی قادر داد اینڈ سنز نے رُوپوں کے جہاز کے جہاز کما لئے۔ قربان علی سے میں نے ایک دفعہ پوچھا کہ اس کو اپنی کتابوں سے کتنی آمدنی ہوئی وہ ٹھیک ٹھیک بتانے سے گریز کرتا ہے لیکن میرا اپنا اندازہ ہے کہ اسے فی ناول پچیس تیس روپے سے زیادہ اوسط نہیں پڑی۔ پبلشرز بے وقوف نہیں ہوتے، جنگ سے پہلے لاہور کا ایک پبلشر منشی گوز بخش، قربان علی کو تین سو صفحات کے جاسوسی ناول کا معاوضہ پینتالیس، پچاس روپے تک دے دیتا تھا۔ وہ قربان علی سے کساد بازاری کا رونا روتا اور اسے یقین دلاتا کہ اس کتاب کے چھاپنے سے منافع کی کوئی توقع نہیں۔ اس کی ایک اور شرط یہ تھی کہ دو ماہ کے عرصہ میں صرف

ب ناول طباعت کے لئے قبول کیا جائے گا، یہ شرط اس لئے تھی کہ غالباً دانا پبلشر قربان علی کے
اوہ دوسرے ہونہار ناولسٹوں کو بھی ہاتھ سے بلنے دینا نہ چاہتا تھا اور اس قسم کا پبلشر بننا
ہیں چاہتا تھا جو ایک ہی مصنف کی کتابیں چھاپتے رہتے ہیں۔ اس کا یہ بھی خیال ہو گا کہ ہر ایک
ی کی بہتات، خواہ وہ کتنی ہی اچھی ہی کیوں نہ ہو، سُود مند نہیں ہوتی اور یہ کہ اس کے
شاعتی ادارہ کے مربی اور مہربان دو مہینہ میں صرف ایک "قربان علی" کو سہار سکتے ہیں.... بہرحال
شیخ قربان علی نے اپنی طرف سے اس بیدار مغز پبلشر پہ واضح کر دیا تھا کہ اگر ضرورت پڑے
وہ اُسے ہر چوتھے روز ایک تازہ جاسوسی ناول لکھ کر دے دینے کا اہل ہے۔

یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ گورنجش نے اپنے نوجوان مصنف کو اس کی محنت کا معاوضہ دینے
میں خست برتی لیکن اگر دیکھا جائے تو قصور جتنا منشی گورنجش کا تھا اتنا ہی قربان علی کا بھی تھا۔
اتنی سادہ لوحی بھی ناقابل معافی ہے منشی گورنجش اپنے مصنف کی مالی قدر و قیمت اچھی طرح
جانتا تھا اور ظاہر ہے کہ مصنف کی قابلیت کے بارے میں اُس کی رائے بہت اونچی تھی۔ وہ
خود قربان علی کے ناول رات کو بستر میں چُھپ چُھپ کر پڑھتا اور کما حقہٗ طور پر سنسنی زدہ ہوتا۔

یہ یاد رہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب قربان علی کی تخلیقی قوتیں اپنی معراج پر تھیں۔
اس کے افسانے شوق سے رسالوں میں پڑھے جاتے تھے اور اس کی ادبی شہرت کافی پھیل چکی
تھی۔ اس کے شائقین یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا چہیتا مصنف موچی دروازہ کی ایک تنگ
کوٹھڑی میں بندہ یہ جذبات کو بھڑکا دینے والے سنسنی خیز ناول لکھتا ہے اور اس کے پاس
ایک پتلون، دو قمیضیں اور ایک چپل ہے اور یہ کہ کئی کئی دن وہ چائے اور خشک توسٹ
پہ گزارہ کرتا ہے۔

منشی گورنجش کے بعد شیخ قربان علی ایک اور پبلشر حاجی قادر داد اینڈ سنز کے ہتھے
چڑھا۔ حاجی صاحب قدرے فیاض تھے یعنی نسبتاً اور قربان علی کا خیال ہے کہ وہ اس کو
اپنی بیٹی بھی رشتے میں دینے کا ارادہ رکھتے تھے اس نیک ارادہ سے وہ بعد میں پھر کیوں گئے؛

ایک اسرار ہی رہے گا کیونکہ قربان علی اس پہ مطلق روشنی نہیں ڈالتا۔ حاجی صاحب کی سرپرستی اور فرمائش پہ ہی شیخ قربان علی نے وہ مشہور ناول "بدمعاش حسینہ" تصنیف کیا جو یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ اب بھی سٹالوں پہ بکتا ہے اور اس کا آٹھواں ایڈیشن چھپ چکا ہے، یقیناً اردو کے مقبول ترین ناولوں میں سے ہے جنہوں نے یہ ناول پڑھا ہے، اس کی گواہی دیں گے، کہ یہ دن کا چین اور رات کی نیند دونوں حرام کر دیتا ہے۔ میری رائے میں یہی اس کا ایک ناول ہے۔ جس میں اس نے جاسوسی ناول کے مروجہ و مسلمہ قواعد سے نکل کر اس صنف میں مختلف راہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک طرح اس جدت اور اس بغاوت کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری کہ پڑھنے والے کو معلوم ہو کہ اردو جاسوسی ناول کے مروجہ و مسلمہ اصول کیا تھے اور ان پر کہیں سختی سے جاسوسی ناول نگار ان مروجہ اصولوں کے اتنے قائل تھے کہ ان کے سب ناولوں کے پلاٹ بالکل ایک سے ہیں اور سب ناول ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

شیخ قربان علی کمار کا کوئی سا ناول اٹھا لیجئے (بدمعاش حسینہ کے علاوہ) اس کے خاتمے تک پہنچنے سے پہلے ہی نہ صرف ان جاسوسی ناولوں کے مروجہ اصولوں کا علم ہو جائے گا بلکہ شیخ قربان علی کے ننانوے فیصدی ناولوں کا پلاٹ بھی ذہن میں ہمیشہ کے لئے آ جائے گا۔ اگرچہ وہ ایسا کہنے پر احتجاج کرتے گا لیکن حقیقت ہے کہ وہ دراصل ایک ہی ناول کو بار بار لکھتا رہا ہے...... اس کے ناولوں میں عناصر تو وہی ہوتے ہیں۔ صرف ان کی ترکیب و ترتیب میں کچھ رد و بدل ہو جاتی ہے.... اس کے ہر نئے ناول میں وہی پہلا ہیرو، پہلی ہیروئن اور پہلا ولین ہوتے۔ مگر مختلف ناموں کے ساتھ پہلے باب میں یہ بتایا جاتا کہ مسٹر منظور پہ کمپنی باغ میں ایک تانگے میں بیٹھی ہوئی عشوہ طراز حسینہ کو دیکھ کر کیا بیتی، حسینہ کی کافر نگاہوں سے عشق کا تیر کیسے مسٹر منظور (ہمارے ہیرو) کے سینے کے پار ہوا اور وہ کیسے سائیکل سے زمین پہ آ رہا .... عین اس وقت تانگے کا گھوڑا ایک موٹر سے ڈر کر بدک گیا اور بے قابو ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مسٹر منظور نے فوراً بے ہوشی کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر کے سائیکل کو پکڑا اسے

ٹمٹمگ کہتے تیجے بھگایا اور زندگی کو خطرے میں ڈال کر گھوڑے کو سامنے سے جاکر تھام لیا اور اس عشوہ طراز نازنین کی جان بچائی۔" بہرحال پہلے باب میں اکثر برقعہ پوش ہیروئن کو کوئی حادثہ پیش آتا ہے یا تانگہ بھاگتا ہے یا وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتی ہے یا کوئی بدمعاش اس کو اکیلا دیکھ کر اس کی بیش بہا دولت چھیننے کے لئے مصر ہو جاتا ہے..... اور پہلے باب میں ہیرو اسے بچا کر عشق کا آغاز کرتا ہے۔ یہاں دو تین باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہیرو کا نام منظور علی فیض علی، مہربان علی ہوتا یعنی مصنف کے نام سے ہم وزن کوئی نام دوسرے یہ کہ ہیرو کے پاس سواری ضروری ہوتی، اس کے لئے گھوڑا ہونا ضروری ہوتا، بعض دفعہ اس کے پاس موٹر ہوتی ورنہ سائیکل تو ضرور ہوتا (قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ شیخ قربان علی کو اب تک ایک سیکنڈ ہینڈ سائیکل خرید سکنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی)

دوسرے باب کے شروع میں یہ شعر ہوتا۔

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس میں مسٹر منظور کے شدید طور پر بیمار پڑ جانے کا ذکر ہوتا۔ وہ ہذیان میں اپنی محبوبہ کے نام کو بار بار دہراتا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا ہوا ہے اور سب کچھ سن رہا ہے۔ تیسرے باب میں ہمارے ہیرو کے ایک جانی دوست مسٹر اشفاق (یا مسٹر سرفراز یا مسٹر انوار) ہیروئن کی سہیلی روح افزا (یا انجم آرا یا ماہ پارا) کے ذریعہ جس پر وہ اگر پہلے سے عاشق نہیں تو ملاقات پر ضرور ہو جائیں گے کسی تنہا جگہ میں مسٹر منظور اور ان کی محبوبہ کو ملانے کا انتظام کر کے فریقین سے اپنی اپنی دوستی کا حق ادا کرتے ہیں جب شروع شروع کی جھجک کے بعد مسٹر منظور اپنی محبوبہ کو آغوش میں لینے کا ارادہ کرتے ہیں، تو مسٹر اشفاق اور روح افزا (نہایت خوش مذاقی کا ثبوت دیتے ہوتے) دونوں کو شربت وصال نوش کرنے کا موقع دیتے ہوئے خود کسی اور تنہا جگہ چلے جاتے ہیں۔

چوتھے باب میں وِلن آتا ہے۔ وہ اپنی موٹر سائیکل پر ہے۔ اس نے ایک سیاہ نقاب پہنا ہوا ہے۔ وہ نہایت بدطینت شخص ہے اور وہی شخص ہے جو اس وقت جب کہ معاملہ نہایت ہمواری سے چلنے لگا ہے، رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لئے آموجود ہوتا ہے۔ قربان علی کے نام قادر حسین، نادر حسین، جابر حسین وغیرہ ہوتا ہے اور وِلن کا نام اس وزن پر رکھنے کی علت کو سمجھنے کے لئے ہمیں غالباً قربان علی کی پچھلی زندگی کے تحت الشعور، لاشعور وغیرہ میں غوطہ زن ہونا پڑے گا۔

چوتھے باب کے بعد وہ سارے سنسنی انگیز واقعات جن کے یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور جن سے جاسوسی ناول کے عاشق بہت اچھی طرح آشنا ہیں —— نقاب پوش کا ہیروئن کو موٹر سائیکل پر بھگا کر لے جانا ہیرو اور انسپکٹر شہباز خاں کا موٹر میں تعاقب کرنا۔ نقاب پوش کا ہیروئن کو لے کر ایک کھنڈر کے نیچے وسیع زمین دوز محل میں غائب ہو جانا، وہ فرار، تعاقب، ڈز۔ ڈز۔ ڈز، پستولوں کا چلنا وغیرہ وغیرہ۔

وِلن کو آخر انسپکٹر شہباز خاں گرفتار کر لیتا ہے اور اس کو پہلے اپنے خوفناک جرائم کی سزا کے طور پر دس بارہ سال کے لئے کالے پانی کا حکم سنایا جاتا تھا (یہ عدالت کا منظر بے حد سنسنی پیدا کرنے والا ہوتا ہے) آج کل کے ناولوں میں کالا پانی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وِلن کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

آخری باب میں مسٹر منظور کی ہیروئن سے شادی اور اس کے باغ حسن کی گل چینی اور دوسرے لذیذ امور کا ایسے منشرح انداز میں ذکر کر کے ناول کو اختتام پہ لایا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کی نیند کا قطعی حرام ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔

سب سے آخر میں یہ فقرہ "پیارے ناظرین! پھر ملیں گے اگر خدا لایا" ہوتا ہے۔ شیخ قربان علی کے معاملہ میں خدا یہ ہر دو ماہ کے بعد کرتا۔ یعنی اسے اپنے پیارے ناظرین سے ملنے کے لئے لاتا۔

بہ مسلمہ قواعد کے مطابق لکھے ہوتے ایک مثالی جاسوسی ناول کا پلاٹ ہے جس پر دس سال پہلے کے سب اردو جاسوسی ناول لکھے گئے ہیں۔ جاسوسی ناول نگاروں کا وہ پیغمبر کون تھا جس نے ان کے لئے یہ قواعد مقرر کئے تھے اور جن کی سخت گیری ان کو یہ اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ ان قواعد کی حدود سے باہر جائیں۔ شیخ قربان علی صرف ایک بار ان قواعد سے ذرا باہر گیا، یہ ایک ہلکی سی بزدلانہ بغاوت تھی 'بدمعاش حسینہ' ہیں اس نے ایک الگ اور مختلف لائن اختیار کرنے کی بے دلی سے کوشش کی ہے 'بدمعاش حسینہ' میں ہیروئن تمام مستند اصولوں کو مسترد کر کے غلط فہمی میں اپنی انگوٹھی کا نگینہ نگل کر خودکشی کر لیتی ہے۔ یہ دراصل ہیرو کا قصور تھا۔ جو وقت پر نہیں پہنچا، آخر میں وہ اپنے دوست کی رضامندی سے ہیروئن کی سہیلی سے شادی کر لیتا ہے۔ اس کا دوست ہیرو کے لئے یہ قربانی کرنے کے بعد اس قدر دل شکستہ ہو جاتا ہے کہ جہاز پر چڑھ کر بغرض سیاحت انگلستان چلا جاتا ہے۔ نقاب پوش ولن جس کا نام اتفاق سے میرے نام پر اقبال حسین ہے اپنے کئے پر پشیمان ہو کر اور اپنے آپ کو اس ٹریجڈی کا سبب جانتے ہوتے تلافی مافات کی خاطر ہیروئن اور ہیرو کے دوست کی قبروں پر (جو ساتھ ساتھ ہیں) جا کر مجاور بن جاتا ہے (یہ خود ہی سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے مجاور بننے سے پہلے اپنا موٹر سائیکل اور نقاب کسی مناسب طریق سے بیع یا رہن کر دیتے ہوں گے) قبرستان میں وہ دن رات قبروں کے سرہانے اپنے ہاتھوں سے لگاتے ہوتے بیری کے پودوں کی آبیاری کرتا ہے۔ اور جس وقت یہ ساڑھے پانچ سو صفحات کا اندوہناک اور سنسنی خیز اور راتوں کی نیند حرام کر دینے والا ناول اختتام پر پہنچتا ہے۔ اس وقت نقاب پوش اقبال حسین ساٹھ سال کا بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے ۔۔ ایک فٹ لمبی سفید ڈاڑھی والا بوڑھا۔ وہ اب اقبال حسین کی بجائے سائیں بیری شاہ کہلاتا ہے۔ بیریوں کے پتے اور ٹہنیاں اب اتنی پھیل چکی ہیں کہ وہ دونوں ایک دوسری پر دست درازی کرنے لگی ہیں اور دو عاشق (ہیروئن اور ہیرو کا دوست جسے ہیروئن سے محبت تھی) جو انسانی شکل میں ہمکنار نہ ہو سکے، درختوں کی شکل میں ایک

دوسرے کے وصل سے لذت اندوز ہو گئے..... پیارے ناظرین! پھر ملیں گے! اگر خدا لایا...

یہ ناول بے حد مقبول ہوا اور ایک ماہنامے کے ایڈیٹر کو اس میں جذبات اور فطرت کی وہ حیرت انگیز نقاشی نظر آئی کہ اس نے مصنف کے ہاتھوں کو چومنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر یہی ناول حاجی قادر داد اور شیخ قربان علی کمار کے کاروباری تعلقات کا جنازہ ثابت ہوا، وہ اس طرح کہ پہلے ایڈیشن میں کاتب کی غلطی سے سرورق پر مصنف کا نام 'قربان علی' کی بجائے 'مہربان علی' لکھا گیا تھا اور چونکہ حاجی صاحب کے ہاں پروف دیکھنے کی رسم نہ تھی، ویسا ہی چھپ گیا۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ کاتب کا اپنا نام بھی مہربان علی تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ حاجی قادر داد کا سگا بھانجا بھی تھا۔ حاجی صاحب نے اگلے ایڈیشنوں میں اس غلطی کی تصحیح کر دی لیکن شیخ قربان علی کے دل میں اب بیل آ چکا تھا۔ اور اس کے حاجی صاحب سے پھر تعلقات استوار نہ ہو سکے...... آخر اس کی لاہور سے ایسی طبیعت اکتائی کہ اس نے اُس تلخ تجربات کے شہر کو الوداع کہی اور بہت سے دوسرے آرٹسٹوں کی طرح کراچی کا رخ کیا۔ وہ کراچی میں ۱۹۴۶ء کے شروع میں آیا۔ اُس وقت اس کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا، رشتہ داروں سے وہ اتنا ہی بیزار تھا جتنا وہ اس سے تھے۔ اس کی عمر اس وقت تیس سال کی تھی۔

وہ سب لوگ جو آرٹسٹ یا فن کار کہلاتے ہیں اور کراچی میں فنکاری کے لئے آتے ہیں مجھ سے اتفاق رائے کریں گے کہ کراچی کی آب و ہوا فن کاروں کے لئے سازگار نہیں ان کو وہاں جا کر مایوسی ہوتی ہے۔ ویسے بھی فن کاروں کے لئے اس ملک میں اب زیادہ کام نہیں؛ نہ ان کی ضرورت سمجھی جاتی ہے، لاہور اس لحاظ سے ابھی بہتر ہے۔ شیخ قربان علی کراچی میں آ تو گیا مگر وہ بعد میں پچھتاتا ہو گا۔ یہاں پر منشی گوہر بخش اور حاجی قادر داد جیسے مرنجان مرنج پبلشر تو تھے ہی نہیں جو اس سے فرمائش پر ناول لکھوا کر اسے دوسرے مہینے پچاس ساٹھ روپے دے دیتے اور اس کی چائے اور سگریٹوں کا خرچہ نکلتا رہتا۔ جب وہ ناقدردانی کی وجہ سے فاقہ کشی کا شکار ہونے لگا اور اس نے محسوس کیا کہ اس طرح سے مترک

کے بھکاریوں کی طرح زندگی اختیار کرنا پڑے گی، تو اس نے تاجروں کے دروازے کھٹکھٹائے ..... وہ خوش قسمت تھا کہ اسے بندر روڈ پر ایک ایکسپورٹ کی فرم میں کلرک کی آسامی مل گئی۔ پچھتر روپے ماہوار پر جو اس لحاظ سے بڑا نہ تھا کہ اس نے اپنی گزشتہ ادبی زندگی میں کبھی ایک ماہ میں اس سے چوتھائی رقم بھی نہ کمائی تھی۔ (وہ مجھے بتایا کرتا ہے کہ اپنی اس رقم کو وہ کافی پاتا ہے۔ شاید میرے دل پر سانپ لٹانے کے لئے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ اس رقم کو کیسے کافی پاتا ہے)

میری شیخ قربان علی کنار سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب اسے کراچی میں آئے تقریباً دو سال ہو چکے تھے اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر وہ ملاقات نہ ہوئی ہوتی اور اگر میں اس شام مڈل وے اسٹریٹ میں ڈاکٹر عزیب محمد سے ملنے کے لئے نہ گیا ہوتا تو مجھے اس وقت کیسا چین اور سکون میسر ہوتا۔ میں اس وقت غالباً دنیا کا مسرور ترین شخص ہوتا، صبح کو میں ہشاش بشاش بے فکر اپنے بستر سے باہر اچھل کھڑا ہوتا اور اپنے فلیٹ کی کھڑکی میں سے لی مارکیٹ کے ٹاور کو سورج کی روشنی میں زریں ہوتے دیکھ کر اپنے آپ سے کہتا "دیکھو ایک اور نیلا دن طلوع ہوا ہے۔ اقبال حسین! کیا تم اسے حسب معمول بیکار سو کر گزار دو گے؟" ......اس کے بعد میں نئے عزم اور گاتے ہوئے دل سے شیو شروع کر دیتا اور ساتھ ساتھ اپنے لاجواب پاکستان ریڈیو سے قوالیاں اور نعتیں سنتا جو میرے خیال میں آدمی کے دل کو شرافت اور نور سے بھر دینے کی تاثیر رکھتی ہیں (روحانیت موسیقی کے روپ میں!) ..... پھر کپڑے بدل کر اور چھڑی ہاتھ میں لے کر میں سیٹی بجاتا ہوا باہر نیلے دن میں نکل کھڑا ہوتا ـــــ دل میں قوالیوں کی معرفت اور دماغ میں دنیا کو فتح کرنے کا عزم.....مگر ایسا نہیں ہونا تھا! شیخ قربان علی کنار اگلے موڑ پر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا ـــ شیخ قربان علی پچاس جاسوسی ناولوں کا مصنف، لوگوں کی قبصوں کا انتھک اُدھار مانگنے والا، اپنی ضروریات کے لئے اپنے آپ کو بالکل اپنے دوستوں کے ہاتھ میں چھوڑ دینے والا شیخ قربان علی زندگی کے موڑ پر میری گھات میں تھا!

وہ حالات جن میں ہماری ملاقات ہوئی قدرے انوکھے تھے اور دوستی کے لئے غیر موافق۔
اور اگر شیخ کٹار کا مجھ سے مصنف کی حیثیت سے تعارف نہ ہوتا تو میں شاید اس ملاقات کے
بعد اس کے متعلق سوچتا بھی نہ..... ایک آدمی کی حیثیت سے وہ مطلق متاثر نہیں کرتا....
مگر وہ ناولسٹ تھا اور پڑھنے والے جانتے ہی ہوں گے کہ میں ناولسٹوں پر جان چھڑکتا ہوں
اور اگر ایک دفعہ وہ میرے ہاتھ آجائیں تو میں انہیں آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ــــ
مقدر ہو گیا تھا کہ یہ ملاقات، ایک بڑی گہری دوستی کا پیش خیمہ ہو، بقول قربان ملی تاریخ کی
عظیم دوستیوں میں سے ایک۔

.....ایک شام میں ڈاکٹر عزیب محمد سے مل کر مڈل وے اسٹریٹ میں سے واپس گھر کی طرف
لوٹ رہا تھا کہ سامنے سڑک کے بیچوں بیچ مجھے اپنا پرانا دوست پروفیسر شاہسوار خاں معالج
امراض رُوحانی وجسمانی آتا ہوا نظر پڑا۔ میں نے پروفیسر کو بڑے عرصے کے بعد دیکھا تھا، وہ
چاکی واڑہ کا اصلی شہری نہیں اگرچہ وہ رہتا یہیں ہے، اور اس کی عادت ہے کہ بعض دفعہ
ایک لمبے عرصے کے لئے چاکی واڑہ سے غائب ہو جاتا ہے۔ دراصل اس کی پریکٹس پاکستان بھر
میں ہے اور وہ ایک قسم کا گشتی ڈاکٹر ہے۔ چاکی واڑہ کئی دفعہ اسے پانچ پانچ مہینے نہیں دیکھتا
اور پھر ناگہاں وہ اس کی گلیوں میں ایک جن کی طرح آنمودار ہوتا ہے۔ چاکی واڑہ میں بھی اس
کے مریدوں کی تعداد کافی ہے اور اس کی عزت اور تعظیم ان کے دلوں میں گہری اور حقیقی
ہے۔ اس کی کرامات جو اس کی اپنی بتائی ہوئی ہیں، فی الواقع محیر العقول ہیں۔

پروفیسر شاہسوار خاں اپنے سیاہ پگڑ، سیدھی نوکیلی مونچھوں اور کارڈینل ریشلو
جیسی ڈاڑھی کے ساتھ ہمیشہ کی طرح ایک حقیقی جادوگر لگ رہا تھا، میں جو اس کے نیاز
مندوں میں سے ہوں۔ دوڑ کر اس سے بغل گیر ہونے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر اس کے ساتھیوں
نے ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ پروفیسر تنہا نہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک مینگوں والا سیاہ بکرا،
سُرخ لنگا پہنے ایک بندریا، اور ایک نابالغ ریچھ تھا۔ ایک چوتھا شخص بھی تھا ــ دُبلا زرد رو

تیس سال کا لمبا سا آدمی جس کا چہرہ چیچک کے داغوں سے مسخ ہو چکا تھا اور جو جگر کی کسی مہلک بیماری کا مریض لگتا تھا۔ اتنا غیر موثر اور غیر اہم شخص تھا وہ کہ میں نے مبہم طور پر اس کو بکرے بندر اور ریچھ کی طرح پروفیسر کا ایک پالتو جانور سمجھا جس کا پروفیسر کے کھیلوں اور ناٹکوں میں کوئی غیر اہم پارٹ ہوتا ہوگا مثلاً بندر یا کو بکرے پر بٹھا کر ریچھ کے پاس منانے کے لئے لے جانا..... یہ میری خوش فہمی تھی! بھلا ایسے حسرت بھرے چہرے والا خستہ دل نوجوان کیا کھیل کر سکتا ہے۔

جیسا کہ پڑھنے والے، تم نے جان لیا ہوگا۔ یہ قربان علی کٹار تھا۔

پروفیسر نے مجھے دیکھ لیا تھا اور مجھے چاروناچار دل کڑا کر کے مصافحہ کے بعد اس سے بغل گیر ہونا پڑا۔ بندریا خرخرانے لگی اگرچہ بکرے اور ریچھ نے ذرا تحمل سے کام لیا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں غائب رہا۔

اُس نے انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا "اس کی ذات ابھی بتانے کی اجازت نہیں دیتی"

"شاہ صاحب! آپ لاہور تشریف لے گئے تھے کیا"؟ میں نے اصرار کیا۔

"ہم اتنا بتا سکتے ہیں کہ ہم عالم بشرات میں نہیں تھے" یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ عالم جنات میں سیر کرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔

"یہ بھی آپ کے ساتھ گئے تھے" میں نے تینوں پالتوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شاہسوار خاں نے مجھے جلال میں آکر دیکھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم دوسرے طبق میں شاہ جنات حضرت سلیمان سے چند اُمور روحانیہ پر تصفیہ کرنے گئے تھے۔ تم قطب تو نہیں ہو؟"

میں نے اقرار کیا کہ میں واقعی قطب ہوں۔ پروفیسر نے اب مشفقانہ نظروں سے

مجھے دیکھا، کسی قطب سے پردہ داری نہیں کی جا سکتی کیوں کہ اس سے دوسرے قطبوں کی حرکات مخفی نہیں ہوتیں — اب وہ ذرا کھل گیا۔

"حضرت سلیمان نے ہمیں چند فوری امور کے لئے بلوایا تھا ان کا اپنا جن المغرور، ہمیں یہاں سے ان کی بارگاہ میں لے گیا اور وہی ہم کو وہاں سے واپس اس دارالفنا میں لایا ہے۔"

"چند جنوں کی بغاوت کا سوال تھا"، پروفیسر نے راز داری کے لہجہ میں کہا۔

"شاہ صاحب - آپ نے اپنے ساتھیوں کا تعارف نہیں کرایا"، میں نے پوچھا۔

"یہ ملا عبدالہدیٰ ہے"، شاہسوار خاں نے اپنے بکرے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ملا عبدالہدیٰ نے اپنے نام کے ذکر پر میں، میں، کر کے پروفیسر کی تائید کی۔

"یہ مس میبی ہے"، پروفیسر نے بندریا کو دور سے میری طرف اچھالتے ہوئے کہا "یہ ابھی تک نصرانیوں کے مذہب پر قائم ہے۔ یعنی کہ عیسائی ہے۔"

"اور اس ریچھ کا ابھی کوئی نام نہیں رکھا"، پروفیسر نے کہا۔

"اور یہ —— یہ کون ہے"، میں نے قربان علی کٹار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہم نے اس شخص سے اس کا نام نہیں پوچھا"، شاہسوار خاں نے کہا "اسے میں نے ابھی ابھی لی مارکٹ کے ٹاور کے پاس بے حد افسردگی سے گھڑیال کی سوئیوں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہوئے پایا۔ ہمیں یہ کسی مرض روحانی میں مبتلا نظر آتا ہے۔ یقیناً کوئی کینہ ور جن اس کے اندر گھس گیا ہے۔ ہم کو رحم آیا اور اس کی حقیقت جاننے کو اسے ساتھ لے آتے ہیں۔"

"میرا نام قربان علی کٹار ہے"، کٹار نے جرأت کی "میں ......"

"کون؟" میں تقریباً چلایا "کون! قربان علی کٹار، مشہور مصنف تو نہیں؟ ...... اردو ادب کا تھامس ہارڈی کٹار تو نہیں؟"

"ہاں میں شیخ قربان علی کٹار گوجرانوالوی ہوں"، اس نے میرے اس اشتیاق پر خوش

ہوتے ہوئے کہا: "آپ نے میری کتابیں پڑھی ہیں ؟"

" آپ کا مطلب ہے آپ شیخ قربان علی کٹارہیں جنھوں نے بدمعاش حسینہ، لکھی - اُردو ادب کا ہولناک ترین اور دلکش ترین رومان"، میں نے وارفتگی میں کہا" یہ میرے لئے کیسی خوش نصیبی کا دن ہے کہ اس وقت اُردو ادب کے ہارڈی اور ادیب شہیر سے کھڑا ہوا یہ گفتگو کر رہا ہوں !"

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ قربان علی کو عمر بھر ایسی وارفتہ تعریف اور پرستاری کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس کے پبلشر نے اسے یہ بھی نہ بتایا تھا کہ وہ کتنا مقبول ہے اور اس لئے میری تعریف اور عقیدت نے جہاں اس کے زرد گالوں پر خوشی اور فخر کی سرخی دوڑائی، وہاں اسے کچھ بوکھلا بھی دیا اور شرمسار سا بھی کر دیا۔ وہ ایک اعصابی سا آدمی تھا اور قربان علی پر زندگی میں کبھی کوئی اس شدت سے قربان نہ ہوا تھا.......

" ہاں کسی زمانہ میں میں اُردو ادب کا تھامس ہارڈی کہلاتا تھا"، اس نے افسوس سے اپنے میلے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے اقرار کیا" اب عرصہ ہوا میں بھول چکا ہوں کہ میں کبھی ادیب شہیر وغیرہ تھا۔ ان دنوں جب میرا شہرہ تھا میری کتابیں بھی میرے اخراجات کی کفیل نہ تھیں، میرے کپڑے ان دنوں زیادہ بوسیدہ ہوا کرتے تھے۔ ادیب شہیر!" اس نے آہ بھری" آپ کو معلوم ہے ادیب شہیر اب کیا کرتا ہے۔ وہ شیخ ٹریڈرز میں ایک ادنیٰ کلرک ہے ستّر روپے ماہوار پر۔"

انسان کے دل کی تلخی بعض وقت اس سے ایک اجنبی کے سامنے ایسی باتیں کہلوا دیتی ہے جو بے حد ذاتی ہوتی ہیں اور اسے ہرگز نہ کہنی چاہیئے تھیں۔ مصنف اس معاملہ میں عام لوگوں سے ذرا سخت مزاج کے بنے ہوتے ہیں، ان کی خودبینی اور انانیت خوفناک حدوں تک پہنچ چکی ہوتی ہے۔ وہ اجنبیوں کے سامنے جلد نہیں کھلتے اور اپنی تلخی کے باوجود محتاط اور خشک رہتے ہیں۔ یہ قربان علی مصنفوں کی عام قسم سے مختلف تھا، اس میں

اُنا کا نام نہ تھا اور وہ اپنے متعلق غیر ضروری طور پر صاف گو تھا، اس حد تک کہ اس کے اعترافات سننے والے کو شرمندہ اور بدحواس کر دیتے.....

"آپ کی کتابیں تو بہت بکتی تھیں،" میں نے کہا "میرا تو اسکول کے دنوں خیال تھا کہ آپ نے خوب روپیہ کمایا ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں کہ کتابیں نہ بکی ہوں۔ دیکھئے نا! ایک تو کتابیں اتنی.... سنسنی خیز۔ دوسرے مصنف مشہور، تیسرے جلد مضبوط۔"

"نہیں،" شیخ کٹار نے میری بات کا مطلب غلط لیا "میری جلد تو مضبوط نہیں، دیکھئے میرا چمڑا بالکل ڈھیلا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے میری جلد کو وٹامن سی کی ضرورت ہے۔"

"میرا مطلب کتابوں کی جلد سے تھا،" میں نے معذرت کی۔

"ہم تم کو کہتے ہیں قربان علی!" پروفیسر نے کہا "ڈاکٹر بکواس کرتا ہے کہ وٹامن سی کی ضرورت ہے۔ تم کو ہمارے تعویذ 'دافع بلیات' کی ضرورت ہے، بڑے سے بڑا جن ہو، زبردست سے زبردست جن ہو، لنگے سے لفنگا جن ہو، دو دن کے اندر اس تعویذ کے استعمال سے اُتر کر ہوا ہو جاتا ہے۔ ہدیہ صرف پانچ روپے۔ لیکن کیونکہ تم میاں اقبال حسین کے واقف معلوم ہوتے ہو اور اپنے ہی آدمی ہو اس لئے تم سے صرف تین روپے قبول کر لیں گے۔"

قربان علی کو کچھ متامل اور کچھ معذرت کرتے پا کر پروفیسر شاہسوار خاں نے بے تکلفی اور دھونس کے لہجہ میں کہا "آؤ! بھائیو۔ یہاں ریسٹوران میں بیٹھ کر چائے پیئں۔ تم کو اپنی کرامات کا حال بھی سنائیں گے،" پھر میرے کان میں ذرا آہستہ "وہاں سے رخصت ہوتے وقت سلیمان بادشاہ نے فرمایا تھا کہ کچھ کھا پی کے جاؤ مگر ہم شرما شرمی میں مارے گئے اور یہ کہتے رہے کہ حضرت، ہم کو بھوک نہیں، جن المغرور، ہمیں یہاں کوئی چار گھنٹے میں لے کر پہنچا۔ میاں! سفر بھی تو کوئی مذاق نہیں، دس ہزار میل ہے۔ یہاں پہنچتے ہی چلہ کشی کا حکم تھا اور ابھی اس کو کاٹ کر باہر نکلے ہیں، کچھ بھوک لگی ہے —— آؤ۔ آؤ۔ بچوؤ۔"

یہ آخری بچوؤ تین پالتوؤں کے لئے تھا۔ جنہیں اس دعوت کی ضرورت نہ تھی، پروفیسر کے

ہاتھوں میں ان سب کی ڈوریں اور رسیاں موجود تھیں اور ویسے بھی پروفیسر کی حیوانات میں عقیدت مندی اور فرمانبرداری کے جذبات ابھارنے کی طاقت ایسی تھی کہ وہ اس کے پیچھے ہر جگہ جانے کو تیار تھے۔ یہ تو صرف رستوران تھا۔

کنگ ایڈورڈ ففتھ راسٹوران یقیناً چاکی واڑا کا سب سے شاندار اور اچھا ریسٹوران ہے۔ لیکن اگر تم چاکی واڑا سے باہر کے بوژوا ہو تو میں تمہیں اس میں آنے کا مشورہ ہرگز نہ دوں گا (اس صورت میں تم چاکی واڑا میں ہی کیوں آنے لگے!) چاکی واڑا کے امرا اور معززین کے لئے یہ کافی اچھا ہے بلکہ ایک طرح کا پرتکلف عیش کدہ ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ آخری لفظ اضافی ہے۔ کنگ ایڈورڈ ففتھ ریسٹوران کی فضا ہرا لا اشتراکی ہے، بعض دفعہ جیبیں کترے جانے کے واقعات یہاں رونما ہو جاتے ہیں اگرچہ وہ عام نہیں، یہ ویٹر جو ایرانی ہے۔ اور ایک مکمل جنٹلمین، اس کی ذمہ داری نہیں اٹھاتا کہ یہاں جیب نہیں کتری جائے گی۔ کوئی شخص خواہ وہ بدحال ترین بھکاری ہی کیوں نہ ہو یہاں آسکتا ہے۔ بشرطیکہ اپنی چائے کے پیسے جیب میں رکھتا ہے، اس کی اسی مستعدی سے خدمت کی جائے گی جیسے کسی سیٹھ کی۔ کسی کے آنے پر بھویں نہیں اٹھتیں اور نہ ہی پروپرائٹر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ جب ہم اور ملاہدی وغیرہ اندر داخل ہوئے تو کسی نے ہم پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہ کیا جیسے بکروں اور ریچھوں وغیرہ کا آنا معمول کا واقعہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ چاکی واڑا کے کسی دوسرے رستوران میں ہمیں اس طمانیت سے گھسنے نہ دیا جاتا۔ یہ فراخدلی اور حقیقی آزادی کی فضا چاکی واڑا کے کئی کششوں میں سے ایک ہے اور یہی باتیں ہیں رسادہ اقتصادیات کے مسئلہ کو چھوڑ کر کہ میں نے اس بے مثال شہر کی مستقل شہریت اختیار کر لی ہے۔

کنگ ایڈورڈ ففتھ کا ـــــ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ اس خوش کن رستوران کے تعمیر میں اور اس کو چلانے میں کوئی ہاتھ نہیں۔ ہاں پیسے دینے والے ڈسک کے اوپر دیوار پر آویزاں ایک بڑے چوکھٹے میں سے اس کی تاجدار اور پژمردہ شکل تمہیں پیسے دیتے ہوئے حوصلہ

افزا النظر سے دیکھتی ہے۔ کنگ ایڈورڈ ہی یہاں ایک بادشاہ نہیں، دوسرے بھی کئی بادشاہ اور ملکہ بھیڑکیلے مدہوش کن رنگوں میں موجود ہیں۔ یہ رسٹوران بادشاہوں کا میوزیم ہے، میرے خیال میں کراچی کے ایرانی رسٹوران والے دنیا کے سب سے شاہ پرست لوگ ہیں۔ وہ بادشاہوں سے محبت کرتے ہیں اور کون نہیں کرتا؟

ہم نے ایک ستون کے قریب رکھی ہوئی میز کے گرد کرسیاں کھینچ لیں تین کرسیاں پہلے ہی موجود تھیں مگر ہمارے ساتھ ملا بدی وغیرہ بھی تو تھے۔ ملا بدی نے کرسی پر بیٹھنے کی بجائے کھڑے رہنے کو ترجیح دی لیکن مس میبی اور رتیچھ خوشی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے پوری احتیاط برتی تھی کہ ان کے اور اپنے درمیان میز کا فاصلہ رکھوں مگر اس کے باوجود میں اپنے دل میں پوری طرح مطمئن اور پرسکون نہ تھا۔ بات کرتے اور مسکراتے وقت مجھے ان دونوں کے ردّ عمل کا بغور معائنہ کرنا پڑتا کہ وہ بُرا تو نہیں مان رہے میری مسکراہٹ تشنج زدہ تھی۔ بدی البتہ میرے دائیں طرف تھا۔ اپنے ریش دار منہ کو میرے اور پروفیسر کے درمیان آگے بڑھائے ہوئے۔ میں اپنی غلط فہمی میں بدی کو ایک اچھا بوڑھا بے ضرر ساتھی سمجھ کر زیادہ توجہ نہ دے رہا تھا۔ حقیقی خطرہ، میں نے سوچا، سامنے مس میبی اور رتیچھ سے ہے زیادہ مس میبی سے۔ رتیچھ کچھ نیم خوابیدہ سا تھا۔

"لاؤ ارے بھئی ہوٹل والو۔ چائے والو، پروفیسر شاہسوار خاں نے نعرہ لگایا۔

ہوٹل والا، ہماری طرف ناپسندیدگی کی نگاہیں ڈالتا ہوا چائے لینے چلا گیا۔ میں شیخ قربان علی کنار سے خالص ادبی گفتگو کرنے اور داد و رسم بڑھانے کے لئے بے تاب تھا مگر یہاں پروفیسر اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی میں وہ دماغی اور قلبی سکون کہاں میسّر تھا۔ جو ایسی باتوں کے لئے ضروری ہے۔ پروفیسر نے جو زیادہ عرصہ چُپ رہنے کا عادی نہ تھا، رُوحانیات میں اپنے مختلف تجربات سُنانے شروع کئے۔ اس نے کئی سرکش ضدی جنوں کے نام گنائے جن کو اس نے جُوتے اور عمل کی مدد سے اپنے مریضوں کے جسموں سے نکال باہر

کیا تھا، اس سلسلہ میں اس نے یہ خوف ناک انکشاف کیا کہ ملّا بدیٔ اینڈ کو دراصل حیوانات نہیں ہیں بلکہ جنات سے ہیں۔ اس نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے ملّا بدیٔ کے سر پہ جھکتے ہوئے فرمائش کی کہ میں اپنا کان اس کے منہ کے قریب لاؤں اور جب میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی تو اس نے رازدارانہ لہجہ میں کہا (وہ مجھے شریک راز کر رہا تھا کیونکہ میں قطب تھا!)۔

"یہ باغی جنات میں سے ہیں اور ہم ان کو عالم بشرات میں سزا دینے کے لئے لائے ہیں"

اس خبر نے کہ بدیٔ وغیرہ جن تھے میرے سکون قلب کو ہرگز نہیں بڑھایا۔

ہوٹل والا چائے لے آیا۔ وہ تین آدمیوں کے لئے تین پیالے لایا پروفیسر جلال میں تھا۔

"تم کو نظر نہیں آتا یہاں چھ بیٹھے ہیں اور تین پیالے لایا ہے۔ فوراً تین پیالے چائے کے اور بنا کر لاؤ، دودھ زیادہ اور گرم پانی کم۔ ہماری طرف اس طرح مت دیکھو ہمیں جلال آ گیا تو وہ کلام پھونکیں گے کہ تم آدمی سے لنگور بن جاؤ گے۔"

ہوٹل والا، کچھ خائف، کچھ بڑبڑاتا ہوا گیا اور تین اور چائے کے پیالے لے آیا، ملّا بدیٔ پہلے ہی میرے پیالے میں منہ ڈالے ہوئے تھا، ریچھ اب کچھ ہوشیار سا ہو کر قربان علی کے پیالے میں تھوتھنی سے سونگھتا ہوا ننھی ننھی چھینکیں مار رہا تھا۔ پروفیسر اور عیسیٰ ہم پیالہ ہوئے تھے۔

"یہ چائے کی بڑی عادی ہے،" پروفیسر نے ہمیں اطلاع دی "کیا میں نے تم کو بتایا ہے کہ یہ نصرانی ہے۔"

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ریسٹوران والوں کے لئے ملّا بدیٔ وغیرہ کا آنا قطعاً غیر معمولی نہ تھا اور صرف معمولی سی دلچسپی کا باعث ہوا۔ تاہم یہ نظارہ چائے والا کے لئے بھی کافی اوٹ پٹانگ اور ڈرامائی تھا ـــــ ریسٹوران میں ہر کسی نے ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیا اور مجھے اگر کوئی چیز یکسر پریشان اور متوحش کرتی ہے تو وہ اس طرح لوگوں کی نگاہوں کا مرکز ہو جانا ہے۔ پھر اُن سب میں ہی ایک ایسا شخص تھا جو بھلا مانس لگتا تھا، جو کم از پاگل نظر نہ آتا تھا۔

اس سے بھی خوفناک باتیں ابھی ہونا تھیں۔ پارٹی امن سے ختم نہ ہوئی، اصل شرارت کی پہل ملا بدی نے کی۔ اس کے باوجود کہ وہ میرے پیالے میں پاتے پھیلا رہا تھا اس کا دل میری طرف سے صاف نہ تھا۔ نہ جانے اچانک اس کے دماغ میں کیا وحشت سمائی کہ اس نے اگلی دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہو کر میرے بالوں کو سونگھنا شروع کر دیا۔ دغا لیا گھاس سمجھ کر، میں نے گھبرا کر پہلے تو شرافت اور ملامت سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر پھر جب اس نے میرے کان کترنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں اسے پیچھے جھٹک کر ہڑ بڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا، عین اسی وقت پروفیسر کے بیچ بچاؤ کے باوجود مس میسی خُرخُراتی ہوئی میز پر سے میری طرف جھپٹی ـــ میز پر پیالوں اور گلاسوں کا چُورا کرتی ہوئی ... کچھ عرصہ بعد میں نے اپنے آپ کو ریسٹوران کے فرش پر چت پڑا ہوا پایا۔ پروفیسر نے میسی کو وقت پر پیچھے کھینچ لیا تھا...... ریسٹوران میں ہر کوئی قہقہے لگا رہا تھا اور میں تھا کہ شرم کے مارے لال بھبھوکا ہو رہا تھا ـــ پروفیسر اپنے حیوانوں کی کارگزاری پر بے حد مسرور تھا اور میرے کھڑے ہونے پر کہنے لگا کہ یہ سب میرا ہی قصور تھا۔

یہ پارٹی یوں ختم ہوئی۔ اور مجھے ہی چائے اور شکستہ برتنوں کے پیسے ادا کرنے پڑے اس لئے کہ پروفیسر کا ایک یہ اصول ہے کہ خواہ وہ خود تمہیں ہوٹل میں دعوت دے، بل کے پیسے تمہیں ہی دینے ہوں گے۔ قربان علی کنار کی طرف سے بل ادا کرنے کی کچھ علامات کا اظہار ہوا مگر آخری لمحہ میں اچانک اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کا بٹوہ کسی دوسرے کوٹ کی جیب میں رہ گیا ہے، بہرحال ہم پیسے دے کر باہر آئے اور اگرچہ پروفیسر شیخ قربان علی سے جدا ہونے پر رضامند نہ تھا، میں اس عظیم مصنف کو بازو سے پکڑا اور پروفیسر سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے۔ اسے اپنے فلیٹ پر لے آیا۔ یہاں میں نے اپنی آٹوگراف بُک کھول کر اس کے سامنے رکھ دی اور پیچھے بیگری میں اپنے ملازم کو آواز دی کہ وہ جلد ایک مرغ بھون کر اوپر لے آئے۔ دوستی کے ایک اچھے کھانے سے زیادہ اور کیا چیز مفید ہو سکتی ہے۔ میرے احساسات کچھ ہمدردانہ اور کچھ انسانیت پر مبنی تھے۔ میں بھی اپنی زندگی میں ایسے شخص سے نہیں ملا تھا۔

جسے ظاہراً فوری شکم پوری کی اتنی ضرورت ہو جیسی کہ اس وقت شیخ قربان علی کٹار کو تھی اور
اس نے بعد میں میرے سامنے اقرار بھی کیا کہ وہ عرصے سے چائے اور سوکھے ٹوسٹ پر جی رہا ہے۔

اس رات باتوں کے فوارے چھوٹ پڑے اور گئی رات تک باتیں ہوتی رہیں۔.... ایک
قمیص اور ٹائی اُدھار لینے کے بعد قربان علی نے رخصت چاہی اور میں اسے چھوڑنے مڈل وے
اسٹریٹ تک اس کے ساتھ گیا۔

اس طرح (میری بدقسمتی سے) بقول قربان علی کٹار، تاریخ کی ایک عظیم ترین دوستی کا آغاز
ہوا اور یہ بھی بقول قربان علی کٹار، یحییٰ یاری کی لافانی کتاب میں ایک اور زریں باب کا
اضافہ ہوا.....

شیخ قربان علی کلارک کی لمبے راہ رومانی زندگی میں اس المناک تذکرہ کے بیان سے بیشتر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ قاری کو اس تاریخ کے بیان گو کے متعلق بھی کچھ تھوڑا بہت علم ہو جائے۔

میں اپنا اور اپنی اللہ توکل بیکری کا ایک رسمی سا تعارف کرانا چاہتا ہوں، میں اپنی گزشتہ زندگی کی تفصیلات سے اسے اُچاٹ نہیں کروں گا۔ نہ ہی صرف طوالت کے خوف سے بلکہ اس لئے بھی کہ بعض تفصیلات درحقیقت قدرے تکلیف دہ ہیں اور ان کو دوبارہ یاد کرنا کوئی خوشگوار کام نہیں۔ یہ تعارف محض اس لئے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ قاری اکثر جاننا چاہتا ہے کہ لکھنے والا کون ہے۔ اس کا پیشہ کیا ہے اور اس کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں۔ اور کیا وہ شادی شدہ تو نہیں۔ لی مارکیٹ کے اس اڈے کے پیچھے جہاں سے لاریاں منگھو پیر جاتی ہیں۔ ایک جنرل اسٹور کے پہلو میں چھوٹا سا بورڈ دکھائی پڑتا ہے۔ جس پر ذرا مٹے ہوئے حروف میں "اللہ توکل بیکری"، لکھا ہوا ہے۔ اس کے نیچے ایک اور چھوٹا سا بورڈ ہے جس پر میرا نام لکھا ہوا ہے جو ایک سال پہلے صاف پڑھا جا سکتا تھا مگر اب پان کی پیکوں کی عنایت سے انسانی آنکھ اسے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے۔

میں، اقبال حسین چنگیزی اس اللہ توکل بیکری کا بلا شرکت غیرے پروپرائٹر اور مینجنگ ڈائرکٹر ہوں اور خدا کے فضل سے میری ڈبل روٹی کراچی بھر میں بہترین مانی جاتی ہے۔ درحقیقت میں بھی اپنی لائن میں فنکار ہوں اور جو کہتے ہیں کہ میری ڈبل روٹی ناقص ہوتی

ہے اور ناقابل خورد نی اشیا میں سے ہے، دراصل وہ ہیں جن کی بیکریاں میرے مقابلے میں مات کھا گئیں...... جب میں اور میرے چند دوستوں نے پہلے پہل (اللہ توکل) کی داغ بیل ڈالی تو ہم میں سے کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ یہ کمپنی بیکری میں ختم ہو گی یا یہ کہ اس کا تعلق کبھی ڈبل روٹیوں سے ہوگا۔ اس کمپنی کے کھولنے سے ہمارا ارادہ یہ تھا کہ چاکی واڑا کو باقاعدہ تجارتی دنیا میں روشناس کرایا جائے۔ حب الوطنی کی بنا پر یہاں کے شہریوں کو باہر کے (یعنی میکلوڈ روڈ کے) درآمدی برآمدی اداروں کے پاس اپنی ضروریات کے لئے جاتا ہوا دیکھنا ہمیں ناگوار گزرتا۔ یہ چاکی واڑا کی توہین تھی۔

کمپنی کی ابتدا بورڈ لگانے کی رسم اور کنگ ایڈورڈ مفقہ میں ایک پرتکلف پارٹی سے ہوئی اور نام اللہ توکل اس لئے قرار پایا کہ سرمایہ وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی کامیابی کا انحصار کافی حد تک اللہ ہی پر تھا۔ دو تین ماہ بعد خسارہ ہوتے پر کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اللہ توکل کمپنی کو کچھ عرصے کے لئے بند کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ڈائرکٹروں کے باپ روپے کی فراہمی کے معاملہ میں کچھ خست کا ثبوت دے رہے تھے۔

اللہ توکل ٹریڈنگ کمپنی اللہ توکل بیکری کیسے بن گئی یہ بذات خود انسانی عزم، کوشش محنت اور فضل ربی کی ایک طویل کہانی ہے جسے میں اور کسی وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں ہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ ایک انسان کے فولادی عزم اور صبر کا پھل ہے۔ مگر میں یہ جلدی سے بتا دوں (مبادا پڑھنے والے کو اس قسم کی خوش فہمی ہو) کہ وہ انسان راقم ہرگز نہیں ہے۔ گو مجھ میں میرے دوستوں کے کہنے کے مطابق بہت سی خوبیاں ہیں لیکن فولادی عزم اور صبر ان میں نہیں ہیں۔ بیکری اور ریسٹوران دراصل میرے ملازم تاج علی سے زیادہ سنہرے دل والا شخص اور ایسا شخص جس میں نمک حلالی، اور کاروباری سلیقہ صحیح تناسب میں موجود ہوں، اگر کہیں موجود ہے تو کم از کم میں نے اُسے نہیں دیکھا۔ تاج علی پہلے دلّی کی ایک بیکری میں اپنے والد کے ساتھ کام کر چکا تھا جس کی بنا پر وہ اس کام کے

داؤں پیچ پر حاوی تھا۔ بلڈنگ کمپنی کے فیل ہونے پر اس نے اپنے باڈس اور شکستہ دل آقا کو بیکری کھولنے کا مشورہ دیا، میں پہلے پہلے مذبذب میں تھا ڈبل روٹی بنانے کے طریقے میرے لئے اسرار تھے اور میری معلومات ان کے متعلق صرف یہ تھیں کہ وہ آٹے سے بنتی ہیں ..... مگر تاج علی نے مجھے یقین دلایا کہ وہ بیکری میں اشیاء تیار کرانے اور اس کو چلانے کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے گا، مجھے مطلق کسی چیز کے لئے تردد نہ کرنا پڑے گا۔ مجھے صرف حساب رکھنا ہوگا۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ میں اس بیکری کا پیرو پیاتر ہوں گا۔

اس طرح اللہ توکل بیکری کی ابتدا ہوئی۔ سرمایہ ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ تھا جو میں نے اپنے باپ سے ادھار لیا کیونکہ اور کوئی مجھ پر اتنی کثیر رقم کا اعتبار کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا.... اوپر کے دو کمرے رہائشی رکھے گئے نچلے لمبے کمرے میں ایک اونچی لکڑی کی اوٹ کھڑی کرکے دو حصے کر دیئے گئے ـــ سامنے کا حصہ ریسٹوران کے لئے اور پچھا، بیکری اور کچن کے لئے۔ پہلے دن ہمارے لئے کافی کشمکش اور فکر مندی کے تھے مگر پھر تاج علی کی ہمت اور محنت سے بیکری چل پڑی۔ اور اب تو ریسٹوران بھی خوب چلنے لگا ہے شام کو اصحاب بصیرت وادراک کا مرکز بنتا ہے، مصنف یہاں آتے ہیں اور مصنفوں کے شکاری بھی اور گفتگو بہترین اور بلند پایہ ہوتی ہے اور ایک دفعہ مجھے اس چھت کے نیچے عظیم ادیب شیخ محمد بلال (اس غیر فانی شاہکار "ظالم سماج" کے مصنف) کو کھانا کھلانے کا شرف حاصل ہوا۔ . . . یہ ان تمام رسٹورانوں کی طرح بھڑکیلا اور شوریدہ اور احمقانہ طور پر فحش نہیں ہے جہاں گراموفون اور ریڈیو کی فحاشیوں سے اس کی پرسکون، اور خاموش فضا کو ملوث کرنے کا روادار نہیں، میرے نزدیک یہ آپ بھی گفتگو . . . کرتے ہیں . . . . اور میرے رسٹوران کی دیواروں پر بادشاہ نہیں . . . میرے ریسٹوران کی دیواروں پر مصنفوں کی تصاویر ہیں۔ اے۔ ڈی۔ کھوکھر سے کہ حضرت مچھلی ماہی گیری اور چودھری نرگس بغدادی تک کی تصویریں ہیں میں نے نام تبدیل نہیں کیا، اللہ توکل ایک اچھا تسکین آمیز نام ہے اور ہر حالت میں ذمہ داری اللہ پر ڈال دینا سود مند ہے۔ اگر بیکری فیل

بھی ہو جائے تو میں بری الذمہ ہی رہوں گا۔

ایک چھوٹی سی بات کی تشریح اور لازم ہے پھر میرا تعارف جتنا کہ ضروری ہے مکمل ہو جائے گا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ کہ میرا نام اقبال حسین چنگیزی ہے اور شاید پڑھنے والے نے اس پر قیاس کیا ہوگا کہ چنگیز خاں اور تیمور لنگ وغیرہ سے میرا تعلق ضرور ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے! (صاف گو ہونا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے) چھ سال پہلے میں تو کیا بلکہ ہمارے خاندان کا کوئی فرد بھی چنگیزی نہ تھا۔ میں خالی خولی اقبال حسین تھا کہ ایک دن میرے پدر بزرگوار نے جو پنجاب کے ایک شہر۔ (میں اس کا نام ہی کیوں نہ لے لوں۔ وہ شہر سیالکوٹ تھا) میں طرح جوگی تھے، پرانے خاندانی مسودات کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ دریافت کیا کہ ہم چنگیزی ہیں۔ ذرا تصور تو کرو کہ ہم اتنے عرصہ یہ جانے بغیر بھی جیتے رہے کہ ہم چنگیزی ہیں! پدر بزرگوار کا فیصلہ یہ تھا کہ ہم ہلاکو خاں کی نسل سے ہیں اور اس کے جائز اور حقیقی وارث ہیں اور اگر انگریز وغیرہ بیچ میں نہ کود پڑتے اور تاریخ کا دھارا سیدھا چلتا رہتا تو پدر بزرگوار اس وقت ہندوستان کے تخت پر براجمان ہوتے۔ ۔ ۔ مجھے اب تک پدر بزرگوار کی اس خاندانی تحقیق کی سچائی میں شک ہے لیکن اگر محض چنگیزی کہلانے سے شاہی خون میری رگوں میں دوڑ سکتا ہے تو کیا حرج ہے۔ ۔ ۔ ۔

شیخ قربان علی اور میری دوستی کی مختلف تفصیلات میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ یہ مجھ سے روپے ادھار مانگنے، میرے خرچ پر سینما دیکھنے، میری قمیضیں اور ٹائیاں استعمال کرنے کی ایک پُردرد کہانی ہے جو ابھی تک جاری ہے۔ تاریخ کی ابدی دوستیاں نبھانے کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس دو سال کے عرصہ میں میری تقریباً آدھا درجن قمیضیں۔ ایک گرم چیک سوٹ، ایک فیلٹ، متعدد ٹائیاں ادھار لے چکا ہے، وہ ان کو ایک آدھ دن کے لئے عموماً ادھار مانگتا ہے، کیونکہ اسے خاص تقریب کے لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ بہترین وضع بنا کر جائے۔ مگر اس کے بعد وہ بڑے مزے سے انہیں واپس

کرنا بھول جاتا ہے۔ بار بار میری چمکدار پھولوں والی امریکن ٹائی پہنے۔ میرا چیک سُوٹ زیب تن کئے وہ ایک بے پروا انداز اور بے داغ ضمیر کے ساتھ میرے سامنے آتا رہتا ہے جیسے یہ اس کی اپنی ہی چیزیں ہوں۔ دوسروں کی اشیاء کو یوں ضمیر کی چُبھن کے بغیر اپنا لینے کے مشکل آرٹ میں بہت کم اس کے مقابل آسکیں گے اور میں نے کئی بار اس کو اپنے سامنے چند دوستوں کو یہ اطلاع دیتے ہوئے سنا ہے کہ یہ سُوٹ جو وہ پہنے ہوئے ہے (یعنی میرا سوٹ) کراچی کے حمید درزی کا سِلا ہوا ہے اور اس کی سلائی سوا سو روپے ہے (جو سچ ہے)۔۔۔ کبھی وہ اپنے دوستوں سے (میری موجودگی میں) کہتا ہے کہ مجھے شوخ امریکن ٹائیاں پسند ہیں اور یہ ٹائی جو میں نے لگا رکھی ہے (یعنی میری ٹائی) اسے ساڑھے آٹھ روپے میں پڑی۔ مصیبت یہ ہے کہ ایسی معلومات دیتے وقت اس کے چہرے پر شکن تک نہیں پڑتی اور الٹا میں ہی اپنے کو شرمسار محسوس کرتا ہوں۔

مجھ سے دوستی کے بعد اس میں واضح تبدیلی یہ آئی کہ جہاں وہ پہلے چاکی واڑا کے بدحال ترین شہریوں میں سے نظر آتا تھا، اب وہ تقریباً زیادہ وقت خوش پوشاک رہنے لگا۔ اس کے دوستوں نے اس حیرت انگیز تبدیلی پر تعجب کیا مگر بہت کم کو اس کا علم تھا کہ اس کی اس خوش پوشاکی سے کسی دوسرے کے سینہ پر سانپ لوٹ رہے ہیں اور یہ کہ یہ نئے چست کپڑے اس کے اپنے نہیں۔ ہمارا قد اور جسم تقریباً ایک ہی سا تھا اور میرے کپڑے اس پر بڑے بھلے فٹ ہی آتے تھے۔ پھر بھی شوخ کپڑوں کا شوقین ہونے کے باوجود اسے کپڑوں کو سنبھال کر رکھنے اور اچھی طرح پہننے کا کوئی سلیقہ نہ تھا، اس کے کالر اکثر میلے اور سیاہ ہوتے اور اس نے ٹائی باندھنا بھی بڑی مدت کے بعد سیکھا۔ ٹائی کا واقعہ بھی عجیب دلچسپ ہے۔ تم جانتے ہو بے چارے قربان علی نے پہلے کبھی ٹائی نہ باندھی تھی اور میں نے خود ہی اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ جب تک آدمی نے ٹائی نہ لگا رکھی ہو اسے پوری طرح خوش لباس، نہیں کہا جا سکتا۔ اسے یقین نہ تھا کہ اسے ٹائی باندھنا کبھی نہ آئے گا۔۔۔۔ وہ اس وقت

پنے دسویں یا غالباً نویں عشق تک۔ ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا اس کے عشق ابتدائی مراحل سے آگے نہیں چلتے، میں نے اسے مشورہ دیا کہ آج کل کی لڑکیاں دنیا کی واڑا میں بھی ظاہری فوں فاں پہ مرتی ہیں اور اس کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ پوری طرح خوش وضع ہو اور اسی سلسلے میں اسے میں نے اپنا نیلا سوٹ پہنایا اور ٹائی باندھنے میں چند سبق دیئے جو اس کی سمجھ میں پوری طرح نہ آسکے ۔۔ آخر میں نے خود ہی اس کی گردن میں ٹائی باندھی اور دعائے خیر کے ساتھ محبوب کی طرف رخصت کیا۔ وہ محبوب چند دنوں بعد ایک اور محبوب سے مات کھا گیا۔ مگر میرا چیک سوٹ اور ٹائی واپس نہ آئے، کافی عرصہ بعد تک جب بھی وہ مجھے ملنے آتا وہ ٹائی اس کے گلے میں بندھی ہوتی اور پہلے سے کہیں زیادہ افسوسناک حالت میں ہوتی۔ پھر مجھ پر راز کھلا کہ جب سے میں نے اس کی ٹائی باندھی تھی، اس نے اُسے نہیں کھولا، وہ اس کو اسی طرح باندھے سوتا رہا۔ شاید اس ڈر سے کہ اگر ایک بار اس نے اسے کھول دیا تو وہ دوبارہ میرے سبقوں کے باوجود اس کو نہیں باندھ سکے گا۔۔۔ وہ یقیناً اسے پہن کر سوتا تھا کیونکہ جب ایک بار میں نے صبح سویرے اسے اس کے فلیٹ پر جا کر جگایا تو وہ میری ٹائی پہنے ہوئے تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اتنا عرصہ نہ تو اس نے غسل کیا ہے اور نہ ہی قمیض بدلی ہے۔ گو بعد میں وہ ٹائی باندھنا سیکھ گیا اور اس کا یہ علم میری ٹائیوں کے ذخیرہ میں معتدبہ کمی کا باعث ہوا۔۔۔۔

اور اب اُس المناک رومان کا آغاز ہوتا ہے۔۔۔۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب شیخ قربان علی کٹار نے اپنے بارہویں اور آخری (امید کی جاتی ہے!) عشق میں قدم رکھا۔ ۲۱ دسمبر کی ایک چمکیلی صبح کو میں اپنے نیلے دھاریدار سلیپنگ سوٹ میں بیکری کے دروازے پر کھڑا، ایک نہایت پُرمسرت موڈ میں، سامنے فلیٹ پر صبح کی تازہ ہوا کھاتی ہوئی ایک سُرخ پوش خاتون سے جسے میں اچھی طرح نہ دیکھ سکتا تھا۔ فلم بے کار کے مشہور گیت کا یہ بند عرض کر رہا تھا (جنہیں وہ نہیں سُن سکتی تھی!) "آیا کرو ادھر بھی مری جاں کبھی کبھی...... ارماں کبھی کبھی، مجھے یقیناً اس خاتون سے (اگر یہ خاتون ہی تھی جو یہ دراصل نہیں تھی یہ اس کا باپ تھا جو سُرخ کمبل اوڑھے تھا) اظہار عشق مطلوب نہ تھا۔ میں محض اس لئے گا رہا تھا کہ مجھے ایک اور نیلے دن کے طلوع ہونے پر خوشی تھی۔ اور اس لئے بھی کہ یہ گیت میرے چہیتے گیتوں میں سے ہے۔ سُرخ پوش ہستی سے خطاب محض دلی مسرت کی اس کیفیت کو مکمل تر اور حسین تر بنانے کے لئے تھا۔ اتنے میں مجھے شیخ قربان علی کی شکل کا ایک آدمی سامنے آتا نظر آیا۔ یقیناً یوں صبح صبح آنے والا شخص کٹار نہیں ہوسکتا، وہ نو بجے سے پہلے اپنے فلیٹ سے باہر شاذ و نادر ہی دیکھا جاتا ہے لیکن پھر میں نے اپنی امریکن چمکتی ہوئی ٹائی پہچان لی، یہ کٹار ہی تھا ـــــ سخت عجلت میں اور واضح طور پر اپنے ادھار مانگنے کے موڈ میں نیلے دن نے اپنی چمک کھو دی، گیت کے الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے اور میں نے انتہائی دہشت کی حالت میں راہ فرار کے لئے ادھر اُدھر دیکھا مگر اس کا موقعہ کہاں تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اس کے حرماں نصیب چہرے پر

مسکراہٹ کا ایک بھوت سا ناچنے لگا۔

"سناؤ یار چنگیزی" اس نے کہا "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ یہ سلیپنگ سوٹ ہے؟"
میرے حلق سے کوئی چیز نگلے جانے کی آواز آئی۔ آخر میں نے جی کڑا کر کے کہا "ہاں یہ ——— ایک ہی سلیپنگ۔ سوٹ میرے پاس ہے۔"

"ہوگا یار کوئی اور بھی۔ ذرا دیکھو تو سہی" اس نے کہا "آؤ اندر بیکری میں چلیں میں تمہارے ہی پاس آیا تھا (جیسے اس میں مجھے کوئی شک تھا) ایک ضروری کام . . . . . "
وہ میرے بازو میں ہاتھ ڈال کر مجھے بیکری میں لے گیا۔ اس نے ایک لاؤ بالیانہ انداز میں ایک طشتری سے ملائی کی ایک خطائی اُٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا "بھئی چنگیزی بات یہ ہے کہ تمہارے پاس . . . . . "

میں نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا "نہیں شیخ قربان علی! میرے پاس اب صرف ایک ہی قمیض باقی رہ گئی ہے۔ جو میں نے پہن رکھی ہے تمہیں اگر یقین نہ ہو تو اوپر چل کر میرے کپڑوں کی الماری اور میرا ٹرنک دیکھ سکتے ہو۔"

مجھے یہ سُن کر افسوس ہوا ہے" اس نے دوسری خطائی طشتری سے اُٹھا کر منہ میں ڈالنے سے پیشتر اس سے مزا لیتے ہوئے کہا جیسے خطائی کھانے کا کوئی ارادہ نہ ہو "پھر بھی میرا پچھلا تجربہ ہے کہ جن دنوں میرے پاس فقط ایک ہی قمیض تھی تو اس سے بھی کام بخوبی چل جاتا تھا۔ مثلاً اپنے فلیٹ میں تم قمیض کے بغیر بھی رہ سکتے ہو اور اس عرصہ میں اس کو نلکے کے نیچے دھونے کے بعد سکھانے کے لئے دھوپ میں ڈال سکتے ہو . . . . لیکن نہیں میں اس دفعہ کسی اور ضروری کام سے آیا ہوں اور یہ کہ وہ کام کتنا ضروری ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں اس سے ہو جائے گا کہ میں نے ابھی تک صبح کا ناشتہ نہیں کیا۔"

میں نے اس واضح اشارہ کو جو اس اعلان کے آخری فقرہ میں موجود تھا، نظر انداز کرتے ہوئے بے بسی میں کہا "اس دفعہ وہ ضروری کام کیا ہے؟" اگر اس کا تعلق اُدھار مانگنے سے

نہ تھا تو وہ ضروری کام کیا ہو سکتا ہے جو قربان علی کٹار کو صبح کی اولیں گھڑیوں میں یوں بستر سے اٹھا کر یہاں لے آیا...... میں قدرے حیران تھا اور سوچ میں پڑ گیا تھا۔

وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور ایک مرتبان کا ڈھکنا اٹھا کر کیک کے ٹکڑے پر ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا "چنگیزی یار! وہ تمہارے پاس ایک سیاہ گاؤن اور وہ پھندنے والی چوکور سی ٹوپی ہے نا جو تم نے بی۔اے کی ڈگری لیتے وقت بنوائی تھی ـــ وہ علمیت اور فضیلت کی اجارہ داری کے امتیازی نشانات! ـــ مجھے ان کی دو تین روز کے لئے اشد ضرورت ہے' صرف دو تین دن کے لئے۔ بے حد ضروری ہے!"

سیاہ گاؤن اور چوکور ٹوپی جو رسم اسناد کے موقعہ پر تم نے اچھے سمجھدار سنجیدہ آدمیوں کو (جو عام حالات میں کبھی ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے) پہنے ہوئے دیکھا ہوگا اور جن میں وہ کچھ کچھ پرندے سے لگتے ہیں، پہاڑی کوؤں سے مشابہ ـــ یہ سیاہ گاؤن اور چوکور پھندنے دار ٹوپی میرے پاس تھے، یہ درست نہیں ہے کہ میں نے یہ بی اے کی ڈگری کے موقعہ پر بنوائے، جب میں ان کو اپنے ایک خالو سے اُدھار مانگ سکتا تھا تو مجھے بھلا ان کے سلوانے اور خاص طور پر بنوانے کے لئے اتنا خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی، میرا خالو مولوی باقر محمد ایک مقامی کالج میں پینسٹھ روپے ماہوار پر عربی کا پروفیسر تھا اور اس جامعہ میں جہاں اُس نے فاضل اجل یا اسی قسم کی ڈگری لی تھی، طلباء کے لئے سیاہ گاؤن پہننا لازمی تھا، وہ عموماً بازار میں بھی سیاہ گاؤن پہنے نظر آتے اور گلیوں میں بچے اسے دیکھ کر متعجب و خوف زدہ ہو جاتے اور بعض تو اُسے بھوت پریت سمجھتے۔ اس جامعہ کے طلباء کے لئے گاؤن پہننا اس حد تک ایک عادت بن جاتا کہ وہ جامعہ سے نکلنے کے بعد بھی اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کو اوڑھے پھرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے بیشتر اس کو بطور کوٹ کے استعمال کرتے تھے، میرے خالو بھی جو بعض دفعہ پا در جامعہ کالج میں آ جاتا تھا، اپنے گاؤن کو کبھی نہ بھولتا جو اس پر ایک نعمت کی طرح کھلتا تھا۔ فقط

نہ تھا تو وہ ضروری کام کیا ہو سکتا ہے جو قربان علی کُمار کو صبح کی اولیں گھڑیوں میں یوں بستر سے اٹھا کر یہاں لے آیا...... میں قدرے حیران تھا اور سوچ میں پڑ گیا تھا۔

وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور ایک مرتبان کا ڈھکنا اٹھا کر کیک کے ٹکڑے پر ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا "چنگیزی یار! وہ تمہارے پاس ایک سیاہ گاؤن اور وہ پھُندنے والی چوکور سی ٹوپی ہے نا جو تم نے بی۔اے کی ڈگری لیتے وقت بنوائی تھی ___ وہ علمیت اور فضیلت کی اجارہ داری کے امتیازی نشانات! ___ مجھے ان کی دو تین روز کے لئے اشد ضرورت ہے، صرف دو تین دن کے لئے۔ بے حد ضروری ہے!"

سیاہ گاؤن اور چوکور ٹوپی جو رسم اسناد کے موقعہ پہ تم نے اچھے سمجھدار سنجیدہ آدمیوں کو دجو عام حالات میں کبھی ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے) پہنے ہوئے دیکھا ہوگا اور جن میں وہ کچھ کچھ پرندے سے لگتے ہیں، پہاڑی کوّوں سے مشابہ ___ یہ سیاہ گاؤن اور چوکور پھندنے دار ٹوپی میرے پاس تھے، یہ درست نہیں ہے کہ میں نے یہ بی اے کی ڈگری کے موقعہ پہ بنوائے۔ جب میں ان کو اپنے ایک خالو سے اُدھار مانگ سکتا تھا تو مجھے بھلا ان کے سلوانے اور خاص طور پہ بنوانے کے لئے اتنا خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی، میرا خالو مولوی باقر محمد ایک مقامی کالج میں پینسٹھ روپے ماہوار پہ عربی کا پروفیسر تھا اور اس جامعہ میں جہاں اُس نے فاضل اجل یا اسی قسم کی ڈگری لی تھی، طلباء کے لئے سیاہ گاؤن پہننا لازمی تھا، وہ عموماً بازار میں بھی سیاہ گاؤن پہنے نظر آتے اور گلیوں میں بچّے اسے دیکھ کر متعجب و خوف زدہ ہو جاتے اور بعض تو اُسے بھُوت پریت سمجھتے۔ اس جامعہ کے طلباء کے لئے گاؤن پہننا اس حد تک ایک عادت بن جاتا کہ وہ جامعہ سے نکلنے کے بعد بھی اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کو اوڑھے پھرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے بیشتر اس کو بطور کوٹ کے استعمال کرتے تھے، میرے خالو بھی جو بعض دفعہ پا دریا مے کالج میں آ جاتا تھا، اپنے گاؤن کو کبھی نہ بھولتا۔ جو اس پہ ایک نعمت کی طرح کھلتا تھا۔ قسمتہ

مختصراً یہ گاؤن اور پھندنے والی ٹوپی دراصل میرے خالو کے تھے، میں نے انہیں واپس اس لئے نہ لوٹایا کہ رسم اسناد کے فوراً ہی بعد میرے خالو کی پنشن ہوگئی اور اس نے چوک میں پرچون اور سائیکل مرمت کی ایک دوکان کھول لی۔ اس نئے پیشے میں اسے اس جُبّے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ اس نے یاد دہانی کرائی اور دوسری وجہ میرے اس گاؤن کو واپس نہ کرنے کی یہ بھی تھی کہ مجھ میں خاندانی تبرکات جمع کرتے رہنے کی کمزوری ہے اور میرے ٹرنک میں پڑا ہوا یہ جبہ ایک طرح میرے اور میرے پیارے خالو کے درمیان ایک کڑی کا سا کام دیتا تھا۔

"ہاں! ہیں تو سہی!" میں نے اقرار کیا۔ میں قربان علی سے اپنے ٹرنک کے مافیہات کے متعلق جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور پھر اس نے ایک دفعہ ان کو میرے ٹرنک میں پڑا دیکھ بھی تو لیا تھا، جب میں نے ادھار دینے کی خاطر ایک قمیض نکالنے کے لئے ٹرنک کھولا تھا، اور مجھ سے اس جُبّے کے مقصد کے بارے میں اس نے کچھ دریافت بھی کیا تھا۔۔۔

"لیکن تمہیں اس کی کیا ضرورت آن پڑی ــــ تم اسے پہننا تو جانتے ہی نہیں۔"

"ہاں میں۔ میں خود ان کو پہننا چاہتا ہوں ــــ مجھے ان کی ضرورت ہے۔ تم جانتے ہو ــــ مجھے کہیں سے معلوم ہوا ہے۔۔۔۔ اس لڑکی نے کسی سے کہا ہے کہ اگر وہ شادی کرے گی تو کسی کالج کے پروفیسر سے۔ تم جانتے ہو! چنگیزی یار، بعض لڑکیاں ادبی مذاق کی ہوتی ہیں، اور یہ لڑکی یقیناً اسی قسم کی ہے"۔۔۔۔

"یہ کوئی نئی لڑکی ہے!" میں نے دہشت زدہ ہو کر کہا کیونکہ دو دن پہلے جس لڑکی کو وہ اپنے خاموش عشق سے نواز رہا تھا یقیناً ادبی ذوق کی نہ تھی بلکہ خواندہ بھی نہ تھی۔ چاکی واڑا کے سب سے غریب طبقے، کمہار (؟) نمونے کا ایک ناتراشیدہ لعل جس میں زیادہ سے زیادہ (؟) جا سکتا ہے) ایک سخت لمُڑوری اور بھونڈی نوع کی جاذبیت تھی (وہ غالباً نمبر گیارہ تھی!)

"اوہ۔ وہ۔ وہ! مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ مجھے حقیقتاً اس سے محبت نہ تھی اور پھر تم تو جانتے ہی ہو اس کا بھائی بے حد اکھڑ انسان ہے اور میرے متعلق اس کے ارادے کچھ اچھے نہ تھے۔ کل شام کو چنگیزی! اس نے مجھے گلی میں گھیر لیا اور میری ٹائی پر ہاتھ ڈال کر میرا گلا گھونٹنے کی کوشش کی اور اس وقت تک جانے نہ دیا جب تک کہ میں نے یقین نہ دلا دیا کہ میں نے اس کی بہن کے متعلق رائے بدل دی ہے۔ نہیں! اس دفعہ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے واقعی عشق ہو گیا ہے۔"

"کیا اس کی طرف سے تمہارے عشق کا کوئی جواب ملا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ کیا اس نے کوئی ایسا اشارہ جس سے تمہیں معلوم ہو کہ وہ بھی تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہے؟"

میں نے ذرا سرد مہری سے کہا کیونکہ اب تک شیخ قربان علی کے عشق عموماً یک طرفہ ہی رہے تھے اور اس کے بیشتر محبوب اس کے عشق سے بے خبر رہتے تھے۔

قربان علی کٹار ایک بے حد چوزہ دل اور محتاط قسم کا عاشق تھا۔!

وہ لوگ جنہیں اس کے سنسنی خیز ناول پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے شاید سمجھتے ہوں گے کہ ان کا محبوب ناولسٹ اپنے ہیروؤں کی طرح بے حد دلیر اور جری اور حسین نوجوان ہوگا۔ وہ بہر دو جہاں کے کسی خوبرو نوجوان جیسا ایک تیز عاشق ہوگا جس کے چھوتے ہی عورتیں پانی ہو جاتی ہوں گی وغیرہ وغیرہ! میں قربان علی سے ڈیڑھ سال کی واقفیت کی بنا پر یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پڑھنے والوں نے اس کے متعلق جو تاثرات قائم کئے ہیں۔ ان کو اصل سے کوئی واسطہ نہیں۔ شیخ کٹار اپنے ہیروؤں کی مکمل ضد ہے ۔ ۔ ۔ ۔ غالباً کوئی ماہر نفسیات اس پر روشنی ڈال سکے گا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص جس نے آج تک کسی عورت کے روبرو بات کرنے کی جرأت نہ کی تھی، اپنے ناولوں میں ایک، من چلا ناقابل مزاحمت عاشق کیسے بن گیا۔ یہ کیونکر ہوا کہ ایک شخص جو انسانوں میں سب سے ڈرپوک اور کم ہمت ہے اور ایک چوہے کو مارنے کی ہمت نہیں رکھتا، اپنے ناولوں میں ایک مکے سے چار پانچ

موٹے تازے بدمعاشوں کو فرش پر چیت کر سکتا ہے۔

"اس بتِ طناز کی طرف سے،" شیخ قربان علی نے ایک سنجیدہ لہجہ میں جواب دیا "بعض ایسی علامات ظہور پذیر ہوئی ہیں جس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ وہ شیخ قربان علی کنار کے وجود سے بالکل ہی تغافل شعار نہیں ہے...." (بس یہاں یہ بتا دوں کہ بعض دفعہ قربان علی کی گفتگو اس کے ناولوں کے رنگین اور بلیغ حصول کی صنعت لیئے ہوئے ہوتی ہے)...."مثلاً آج شام جب میں گلی میں سے گزرا، وہ اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ اپنے دراز سیاہ گیسو بکھیرائے مجھے دیکھ کر وہ اندر نہیں گئی بلکہ اسی طرح کھڑی رہی ——— اب اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"اس کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہیں کوئی اہمیت ہی نہ دی ہو۔" میں نے کہا "ہر کوئی گلی میں سے گزر سکتا ہے۔ اور وہ اپنے فلیٹ کی بالکونی میں سارا دن کھڑی رہ سکتی ہے۔ محض اس وجہ سے کہ یہ اس کے فلیٹ کی بالکونی ہے؟"

"خیر ان باتوں کو چھوڑو!" چنگیزی یار" وہ کاؤنٹر کے پیچھے رکھی ہوئی اونچی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا (اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا جلدی ہلنے کا ارادہ نہیں ہے) "تم عورتوں کے ان لطیف اور گہرے اشاروں کنایوں کو نہیں جانتے جن سے وہ عاشقوں سے اپنی محبت جتاتی ہیں، دراصل تمہارا مطالعہ قلیل ہے اور میں یقین نہیں کر سکتا کہ تم نے میری تصنیفات کو پڑھا ہو (جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے) اور عورت کی فطرت سے اس قدر بے خبر رہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایک دفعہ رسالہ اچھوتا تخیل کے ایڈیٹر نے میرے ایک افسانے کے اوپر میرے نام سے پہلے 'نباض نسوانیات' لکھا تھا۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم ایک دفعہ پھر، عورتوں کی فطرت کو سمجھنے کے لئے، میرے سب ناولوں کا ذرا گہرائی سے مطالعہ کرو۔"

یہ سب کچھ وہ آدمی کہہ رہا تھا جس کے متعلق مجھے یقین ہے، کہ وہ کپکپی کئے بغیر کسی

عورت کے سامنے نہیں آسکتا اور جو عورتوں سے اس قدر خائف ہے جیسے وہ شیر ببر ہوں!

"اچھا چنگیزی!" اس نے ڈھٹائی سے کہا" وہ اپنے آدمی سے کہو کوئی خنوڑی پلٹنے لائے یا کافی بہتر رہے گی۔ کافی ملائی کے ساتھ، اور پھر میں اس لڑکی کی تسخیر کے لئے اپنے "جنرل پلین" کی وضاحت کروں گا جس پر عمل کرنے کا میں ارادہ رکھتا ہوں اور جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ اگر اس پر استقلال اور عزم سے عمل پیرا ہو جائے تو ضرور خاطر خواہ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں... مگر پہلی چیز اس وقت کافی۔ کافی ملائی کے ساتھ!"

جب وہ کافی پر جھکا ہوا بیٹھا تھا جس میں میں نے اپنے عدم تعاون کے اظہار کے طور پر شمولیت سے انکار کر دیا اس نے مجھے اپنی اس جنرل پلین کے بارے میں بتایا، یہ پوری جنرل پلین تو کچھ کچھ میرے خیال میں مارشل پلین کی لائنوں پر تھی اور اتنی ہی دقیق اور ناقابل فہم۔ یہ تین مہینے کی پلین تھی اور حکومت کے پلینوں سے اس لحاظ سے مختلف کہ وہ عموماً پانچ یا چھ سال کی مدت سے کم عرصہ کو خاطر میں نہیں لاتیں اور اس عرصہ کے اختتام پر اگلے پانچ چھ سال کے لئے جاری رکھی جا سکتی ہیں۔ مجھے شیخ قربان علی کی سہ ماہی پلین کا صرف پہلا حصہ سمجھ میں آیا جو مختصراً ان پہلے اقدامات سے متعلق تھا جو وہ اپنی نئی ماہر و بیں اپنے وجود کا شدید احساس پیدا کرنے کے لئے کرے گا اور جن کے لئے میرے گاؤن اور چوکور پھندنے والی ٹوپی اشد ضروری تھی۔ پلین کو سمجھنے کے لئے یہ ماننا پڑتا تھا کہ لڑکی لٹریچر کی تا تپ تھی (اس کے لئے قربان علی کی مشتبہ قوتِ تمیز اور رائے پر اعتبار کرنا پڑے گا)...

پھر یہ بھی فرض کیا گیا تھا کہ اس نے کسی سے باتوں باتوں میں یہ کہا تھا کہ وہ پروفیسروں کی مشتاق ہے۔ شیخ قربان علی کا لڑکی جیتنے کے لئے پہلا قدم پلین کی رو سے بالکل واضح تھا۔ اسے پہلے نہ صرف لڑکی کو اپنی ہستی کا احساس دلانا تھا بلکہ اُسے کسی طریقے سے یہ بھی جتانا تھا کہ وہ قربان علی کتنا بڑا پروفیسر ہے۔ اس کے لئے اُسے کم از کم ہفتہ بھر کے لئے ایک خالص پروفیسر کا روپ اختیار کرنا ہوگا، پروفیسر کی طرح چلنا، پروفیسر کی طرح آپ

ہی آپ باتیں کرنا اور مسکرانا، پروفیسر کی طرح گاؤن اور چوکور ٹوپی پہننا (ویسے اس ابتذال پذیر زمانے میں پروفیسر پروفیسر نہیں رہے اور انہوں نے سوائے رسمِ اسناد وغیرہ کے موقعوں کے اپنے عالمانہ خلعتوں کا استعمال متروک کر دیا ہے)، یہ تھا مختصراً پلین کا پہلا حصہ، دوسرے اقدامات بھی جو قربان علی کے نزدیک حقائق کی توجیہہ اور دلیل اور عورتوں کی فطرت کے بارے میں اس کے حیرت انگیز علم پر مبنی تھے، ذرا اُلجھے ہوئے اور غیر واضح تھے اور اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں آئے۔ ان کا ذکر یہاں ضروری نہیں کیونکہ بعد میں جیسا کہ پڑھنے والے کو آگے چل کر معلوم ہوگا مختلف حادثات اور اتفاقات کی وجہ سے پلین کے باقی حصوں میں شدید ترمیمیں کرنا پڑیں اور بالعموم نئے حالات نے نئے اقدامات سُجھائے۔ "قربان علی سہ ماہی پلین"، نے، اپنے بنانے والے کے خیال کے مطابق، بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دیا۔ (عموماً سب پلینوں کا یقینی حشر!) اور اسے بالآخر ترک کر دینا پڑا۔

مجھے یہ پلین دیوانگی پر مبنی معلوم ہوتی اور قربان علی کے پچھلے معاشقوں کے تجربہ کی بنا پہ مجھے اس کی کامیابی کی مطلقاً اُمید نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے آپ کو لڑکی کی نظر کے علاوہ، گلی میں رہنے والے دوسرے مکینوں کی نظروں میں بھی مضحکہ خیز بنا لے گا ــــ تاہم قربان علی عورت کی فطرت کے متعلق سب کچھ جانتا تھا! اور میں کچھ بھی نہیں۔

میں نے اسے کچھ اپنی لازوال تاریخی دوستی کی خاطر اور کچھ اس لئے کہ میرا گاؤن اور چوکور ٹوپی بھی اب قصیوں کا راستہ اختیار کرنے والے تھے (وہ راستہ جس پر سے کوئی بھی لوٹ کر نہیں آیا) اسے مخلصانہ طریق پر اس مجنونانہ ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"تمہارے دماغ میں یہ خیال ڈالا کس نے ہے،" میں نے کہا۔ "قربان علی! تمہارا گاؤن اور چوکور ٹوپی پہن کر پھرنا تمہیں بابا کی داڑھا کا نشانہ تضحیک بنا دے گا۔ چھوٹے بچے تمہیں دیکھ کر اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے الگ جائیں گے، بڑے بچے تمہارے پیچھے تالیاں بجاتے ہوئے

دوڑیں گے۔ کمار! گاؤں کے نتائج پر غور کرو اور اگرچہ عورت کی فطرت کے متعلق میرا علم تمہارے علم کا عشر عشیر بھی نہیں مگر میں یہ شرطیہ کہتا ہوں کہ وہ لڑکی جس کے لئے تم پروفیسر بننے لگے ہو تم سے محبت کرنے کے بجائے تمہارا مذاق اُڑائے گی۔"

یہ تھی صاف بے ٹوک مخلصانہ نصیحت!..... اس پر اس کا اتنا ہی اثر ہوا جتنا ایک پتھر پر بلکہ میرے خلوص کو اس نے میری خود غرضی اور گاؤں سے جُدا ہونے سے نارضامندی پر محمول کیا ــ وہ ایک فلسفیانہ انداز میں، سامنے رکھے ہوئے کریم بنوں کے مرتبان پہ خالی سی نظریں گاڑے کہنے لگا"..... دراصل اس زمانہ میں سچے دوست ناپید ہو چکے ہیں بے غرض دوست چراغ لے کر ڈھونڈے سے نہیں ملتے.... چنگیزی یار! دوست وہ ہوتا ہے جو وقت پر کام آئے اور جہاں اس کے دوست کا پسینہ گرے وہاں خون بہانے سے دریغ نہ کرے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر مرتبان سے ایک بڑا کریم بن نکالتے ہوئے مجھ پر الزام لگایا کہ میں اس کے لئے عشق میں اس کی کامیابی کا متمنی نہیں، میں بظاہر اپنے گاؤن کو اس جیسے دوست سے زیادہ عزیز جانتا ہوں" وغیرہ وغیرہ

میں کچھ کٹ سا گیا۔ جب کوئی میری دوستی کے خلوص پر حرف لاتا ہے میں حاتم طائی کی طرح تاؤ میں آکر سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں۔ اگر اسے گاؤن اور ٹوپی کی ضرورت ہے تو اسے لے جانے دو۔ گاؤن اور ٹوپی تمہارے تو کسی کام کی بھی نہیں.... اور اگر قربان علی کمار بے وقوف بننا چاہتا ہے اور ہنسی اُڑوانا چاہتا ہے تو یہ اس کا اپنا معاملہ ہے۔ میں اسے گاؤن اور ٹوپی دے دوں گا..... جو کچھ ہو تاریخ کی ابدی دوستی پر کوئی حرف نہ آنا چاہیئے۔

"اچھا! قربان علی" میں نے کہا "میں نے صرف اپنی طرف سے مشورہ دیا تھا...."

"مشورہ کے لئے شکریہ" اس نے بن کھاتے ہوئے کہا "مگر یار چنگیزی میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ جہاں تک عورت کی فطرت کا تعلق ہے تم بچے ہو۔"

"میں گاؤن اور ٹوپی ابھی لاتا ہوں۔" میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا "مگر یہ خاندانی تبرکات ہیں، میرا مطلب ہے۔"

"میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ پانچ چھ روز میں واپس کردوں گا؟ جنرل ملین کی رو سے ان کا ہفتہ کے بعد پہننا ضروری نہیں۔ چنگیزی یار! وہ تمہارے پاس پیٹنٹ لیدر کے بوٹ بھی تو تھے!" میں اُوپر سے گاؤن اور ترکونی ٹوپی لے کر آیا اور قربان علی کو دیکھ کر مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ باچھیں کیسے کِھلتی ہیں۔ قربان علی کے معاملہ میں باچھیں زیادہ نہ تھیں مگر جتنی بھی تھیں وہ گاؤن اور چوکور ٹوپی کو دیکھ کر کھل گئیں۔ ۔ ۔ ۔ پھر باچھیں فوراً ہی سکڑ گئیں اس نے پیٹنٹ بوٹوں کی عدم موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔

"اوہ یار! وہ پیٹنٹ بوٹ تو تم لاتے ہی نہیں۔" اس نے کہا۔

میں نے ایک اذیت زدہ مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اوہ! وہ تو میں بھول ہی گیا۔ ابھی لاتا ہوں۔" اور پھر میں سیڑھیوں کے اُوپر چڑھا اور اپنے کمرے سے پیٹنٹ بوٹوں کا جوڑا اُٹھالایا جو میں ڈانس پر پہن کر جایا کرتا تھا جن پر میرے چالیس روپیہ خرچ آئے تھے اور میں جانتا تھا کہ وہ میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

قربان علی بے حد خوش تھا، وہ گاؤن ٹوپی اور بوٹوں کو وہیں اسی وقت پہن لینا چاہتا تھا، پھر اس نے ارادہ بدل دیا، اس نے ان چیزوں کو بغل میں داب کر کرسی سے اُٹھتے ہوئے بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا "چنگیزی! تم میرے سچے دوست ہو، اور میرے واحد دوست۔ ہماری دوستی دراصل تاریخ کی ابدی دوستیوں میں سے ہے۔ ۔ ۔ ۔ آج شام کو میرے فلیٹ پر آنا۔ میں تم کو اپنی محبوبہ دکھاؤں گا۔ وہ ایک کمرانی سردار کی بیٹی ہے ۔ تیکھی چتون۔ چشم آہو۔ سڈول جسم۔ وہ دنیا کی خوبصورت ترین اور معصوم ترین لڑکی ہے۔ اس دفعہ فی الواقع میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سچا عشق ہے۔

پہلے عشق تو میری ناپختگی کے نتائج تھے"۔ ۔ ۔ ۔

اس کے فقرے کے پہلے دو جملوں نے میرے دل کو بے حد متاثر کیا میں بیٹھ کر رونا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں شام کو اس کی فلیٹ پہ آؤں گا کیونکہ کون ایک حسین چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا، اور اسے خیر باد کہہ کر اوپر نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے کے لئے چلا گیا۔ گاہک آنے شروع ہو گئے تھے۔

شام کے وقت میں شیخ قربان علی کنار سے ملنے گیا۔ میں ہمیشہ اس سے کئے ہوئے وعدے پورے کرتا ہوں کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ قمیضیں اُدھار مانگنے کی عادت کے باوجود اس کی صحبت دلچسپ ہوتی ہے۔ اس کی محبت کی نئی یلغاریں جو شروع ہی سے ناکامیابی اپنی قسمت میں لئے ہوتی ہیں، میرے لئے بے حد اضطراب اور دلچسپی کا موجب ہوتی ہیں۔ یہ واقعی ترحم کا مقام ہے کہ شیخ کنار یہ نہیں سمجھتا کہ وہ قطعاً، قطعاً اس قسم کا شخص نہیں جس سے کوئی عورت عشق کر سکے، شیشے میں ایک نظر اسے یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہونی چاہیئے مگر شاید بدصورت سے بدصورت شخص بھی صبح کو حجامت کرتے وقت آئینہ میں جب اپنی شکل دیکھتا ہے تو اسے اس میں ایک ایسا حسن ایک ایسی دلفریبی سی نظر آتی ہے جو دنیا کے باقی انسانی چہروں میں عنقا ہے۔۔۔ محبوبوں کے بارے میں اس کا مذاق، اس کا اقرار کرنا پڑے گا، اتنا بُرا نہیں۔ عموماً اس کے محبوب اس معیار پر منتخب کئے جاتے ہیں جو اس کے مشہور ناولوں کی ہیروئنول کے لئے مخصوص ہے وہ سب آہو چشم، نازک اندام، عشوہ طراز ہوتے ہیں۔ سب سچے فنکاروں کی طرح وہ حُسن کے لئے نگاہ ضرور رکھتا ہے۔

شیخ قربان علی مڈل وے اسٹریٹ میں رہتا ہے، میں اور میرے چند دوست اُسے سوگوار حسیناؤں کا کوچہ کہتے ہیں۔ یہاں چھوٹے اضمحلال پذیر گھروں میں مقید، سڑتی ہوئی بوریوں والی بالکنیوں کے پیچھے، کئی ملول زرد حسینائیں، کئی انمول گدڑی کے لعل ان شاہزادوں کے عشق میں گھل رہی ہیں جو کبھی نہ آئیں گے۔۔۔ اور جب کوئی

شاہزادہ آتا ہے تو اکثر شیخ کُنار کی طرح بزدل اور مایوس کُن ہوتا ہے۔ مڈل وے اسٹریٹ میں چند معمولی دوکانیں ہیں ـــــ امان اللہ خاں تمباکو فروش (کارپوریشن اسٹریٹ سے داخل ہوتے وقت دائیں کو)، عبدالحق زین ساز، فضل محمد زرگر، گل محمد غریب، جوتے بنانے والا، کولین بین چیناد ندان ساز (کولین بین کو اپنی موٹی بیوی اور ایک درجن بچوں کے ساتھ دوکان میں بیٹھے ہوئے ہر وقت، دیکھا جا سکتا ہے) حاجی محمد حاجی ابوبکر سوڈا واٹر کمپنی، ملا حاجی محمد عبداللہ پارچہ فروش ـــــ یہ جاکی واڑا کے اصل سوداگر بچے ہیں۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ حاجی صرف دو ہیں اور وہ بھی اتنے فارغ البال اور خوش حال نہیں جتنے ان کے دوسرے اَن گنت بھائی جو میریٹ روڈ اور بمبئے بازار میں اپنی دوکانوں کے اوپر کے بورڈوں پر سے اپنی "حاجیت" کو جلی حروف میں نکھارتے ہیں۔ ... ہوٹل یہاں غلیظ اور مفلوک الحال ہیں، بے حد مفلسانہ بے حد معمولی۔ گھوڑا گاڑیاں یہاں نہیں چلتیں، اگر ایک آدھ وکٹوریہ نظر آتی ہے تو وہ ایسی قدیم اور ایسی ابتذال و نکبت کی حالت میں کہ آدمی کو اس کی حالت پر افسوس ہوتا ہے اور وہ تعجب کرتا ہے کہ کون اس الٹے جاٹے فرتوت چیز میں چڑھتا ہوگا اور یہ شے کیوں پڑانے لوہے کے کباڑی کی دوکان پر ٹکڑوں ٹکڑوں کی صورت میں ہونے کی بجائے ابھی تک اپنے پہیوں پر ہے۔ زیادہ مکان چوبی تختوں، کھجور کی چھال کے بنے ہوئے ٹاٹوں اور گارے کا امتزاج سے کھڑے کئے ہوئے ڈھانچے سے ہیں اور آگے جا کر مڈل وے اسٹریٹ اپنے کو پیچ پیچ بھول بھلیوں میں کھو دیتی ہے جہاں عورتیں اپنے لمبے، پر تصویر پھولدار فرغلوں اور چاندی اور پیتل کے زیورات پہنے ایک دل رُبا مستانہ وار چال سے بہتی ہوئیں ملیں گی، جاکی واڑا کی عورتیں چلتی نہیں۔ وہ بہتی ہیں۔ یہ کراچی کا ایک ایسا حصہ ہے جو بجائے خود ایک الگ شہر ہے، اپنی ایک الگ تہذیب، اپنا الگ اخلاق جنے ایک مدافعت آمیز انفرادیت کا علم سربلند کئے۔ اگر تم ان بھول بھلیوں میں سے سیدھے چلتے جاؤ تو کیچڑ اور بدبو کے اس مرکب پر جا نکلو گے جسے دریائے لیاری کہا جاتا ہے۔

اور جوجا کی واڑا کے لئے وہ کچھ ہے جو لندن کے لئے ٹیمز یا پیرس کے لئے سین۔ دریا تے پیاری رجب ہر کوئی اسے دریا کہنے پر مصر ہے تو چلو، ہم بھی ایک لحظ کے لئے اسے دریا مان لیتے ہیں) کی سیر گاہ کے بند پر تم اپنے نیچے گوبر کے اوپلوں سے پٹی ہوئی زمین پر، گھاس اور بدبو دار کیچڑ میں لوٹتی ہوئی بھینسوں سے پرے دوسرے کنارے کے کھجور کے درختوں اور بنجر پہاڑیوں کو دیکھ سکتے ہو۔ سیر گاہ کے بند سے دنیا کو ابتذال کی آخری منازل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

لیکن قربان علی کٹار کے فلیٹ پر پہنچنے کے لئے تمہیں اتنا دور نہیں جانا پڑے گا اور نہ اس بھول بھلیوں کے حصے سے گزرنا پڑے گا (جو مڈل وے اسٹریٹ کی اپنی امالت اور شرافت کے کھو جانے کے بعد کی شکل ہے) حاجی محمد چارہ فروش کی دوکان سے ذرا آگے تم سڑک کے وسط میں ایک واٹر پمپ پر آ ؤ گے (اگر خوش قسمت ہو تو یہاں چند حسینائیں کھڑی مٹکے بھر رہی ہوں گی) دائیں طرف ایک چھوٹی سی دوکان ہے جس کے اوپر دیوار پر بڑے سفید پھیلے ہوئے حروف میں لکھا ہے "یہاں حسن علی کا سوڈا لیمن اور لسی ملتی ہے" جو میں اور شیخ کٹار کئی دفعہ آزما چکے ہیں۔ اس دوکان کے بالکل سامنے اسٹریٹ کے دوسری طرف ایک بڑی عمارت ہے جو جا کی واڑا کی معدودے چند باعزت عمارتوں میں سے ہے۔ یہ سہ منزلہ ہے اور ٹھوس پتھر کی ہے، تین چار مرحوم کمپنیوں کے بورڈ اب تک اپنے آہنی نکلے ہوئے بازوؤں سے (جو دیوار کے ساتھ زاویہ قائمہ کے سوا اور ہر قسم کے زاویے بنا رہے ہیں) آویزاں ہیں اور نیچے گزرنے والوں پر گرنے کے منصوبے باندھے بیٹھے ہیں مگر ابھی وہ لوگ اُن کے نیچے سے نہیں گزرے جن پر وہ گریں گے۔ اور جن کے انتظار میں وہ اس طرح لگے ہوئے ہیں..... انہی دنوں شاید وہ بدنصیب گزرے۔ بورڈوں کے علاوہ بڑے دروازے کے اوپر سلاخوں میں تاروں کے گچھوں سے دو تین چوبی تختیاں بھی بندھی ہوتی ہیں اور یہ تختیاں تم کو اس عمارت کے چند سکونت

پذیر اشخاص کے ناموں اور پیشوں کے متعلق چند سرسری اور انکسار آمیز معلومات دیتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ ان تختیوں پر کندہ ناموں کے حامل سالوں پہلے یہاں رہتے ہوں اور اب دریائے لیاری کے قبرستان میں جا لیٹے ہوں اور یہ ناموں کی تختیاں محض کتبے ہوں۔ یہ ممکن ہے بلکہ بے حد اغلب۔ مگر کم از کم ایک تختی کے نام کے مالک کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی تک یہیں مکین ہے اور میری کم ہوتی ہوئی قمیضیں مجھے ہمیشہ یاد دلاتی رہتی ہیں کہ وہ شخص ابھی تک بے حد زندہ اور مستعد ہے.... اس شخص کا نام (کیا مجھے اس کا نام بتانے کی ضرورت ہے) شیخ قربان علی کٹار ہے۔ پہلو بادشاہ عبدالمطلوب جونپوری والے ٹھیکیدار، کی تختی کے بالکل ساتھ، اپنی ہمسایہ تختی کی طرح تاروں کے ساتھ سلاخوں سے بندھی ہوئی اور افقی سطح سے پینتالیس درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی ایک گہرے سبز رنگ کی تختی ہے جس پر سفید حروف میں یہ قلب کو چراغاں کر دینے والی عبارت رقم ہے۔

مصور فطرت نباض نسائیات، شاہ اسرار حضرت ایس۔ کیو۔ علی کٹار گوہر الوالوی
یہاں ناول نویسی قلیل عرصہ میں مکمل سکھلائی جاتی ہے اور معاوضہ پر ناول بھی لکھ کر دیئے جاسکتے ہیں۔ پوری تفصیلات کے لئے اُوپر تشریف لے چلئے
اُوپر فلیٹ نمبر دس میں کٹار صاحب آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

تختی پر گرد کی ایک موٹی تہ جمی ہوئی ہے اور آخری تین چار سطور ایسی مٹی ہیں کہ پڑھی تک نہیں جاتیں۔ یہاں شیخ قربان علی کٹار کی خوش قسمتی سے کوئی اُردو پڑھنے والا نہیں ورنہ ایسی فرحت بخش عبارت کٹار پر ضرور عملی مذاقوں کا باعث ہوتی۔ قربان علی اردو کے سب مصنفوں کی طرح) خود نمائی کے جذبہ سے بالکل تو خالی نہیں ہے اور ان سب کی طرح وہ بھی بعض اوقات عظمت اور ابدیت کے سُہانے سپنے دیکھتا ہے اور دنیا کو اپنے نام سے گونجتے ہوئے سنتا ہے مگر وہ اس قدر خود نما اور شیخی باز نہیں جس کا کہ اُوپر کی تختی سے گمان ہوسکتا ہے۔ ویسے ملاقاتوں میں وہ اپنے ادب کے معاملے میں کافی

منکسر المزاج معلوم ہوتا ہے اور میں نے اسے ادب کے بارے میں گفتگو کرتے بھی کم سُنا ہے جیسے یہ اس کے لئے ایک شغل ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر تم اسے اُردو ادب کا تھامس ہارڈی کہو تو وہ خوشی سے پھُولا نہ سمائے گا اور تم سے یہ اقرار نہیں کرے گا کہ اس نے تھامس ہارڈی کو نہیں پڑھا اور یہ کہ اسے خبر نہیں کہ تھامس ہارڈی کون بلا تھا اور کس قسم کے ناول لکھتا تھا۔ یہ ایک ایسی کمزوری ہے جو قابل معافی ہے!

نہیں! یہ تختی اس کے جذبۂ خود نمائی پر دلالت نہیں کرتی۔ بات یہ ہے کہ جب وہ چاکی واڑا میں آکر پہلے پہل رہنے لگا تو اسے پیٹ بھرنے کے لئے کسی پیشہ کی ضرورت تھی؛ وہ دنیا میں ایک ہی کام کرنے کا اہل تھا۔ جاسوسی ناول لکھنے کا اور اس فن میں بہت کم اس ملک میں اس کے سامنے ٹھہر سکتے تھے وہ ایک مکمل چار سو صفحات کا ناول چار دن میں قلم برداشتہ لکھ دینے کا اہل تھا اور بغیر کسی دماغی یا جسمانی بار کے اس رفتار کو کئی سال تک قائم رکھنے کی قدرت اپنے میں رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ وہ ناول نویسی کا پیشہ ور استاد بن جائے گا یا شوقین لوگوں کے لئے معاوضہ پر ناول دیا کرے گا۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ انگلستان اور امریکہ میں ناول نویسی کے کورس دیئے جاتے ہیں اور کئی مقبول ناولسٹ اب معاوضہ پر نئے اُمیدواروں کو ناول نویسی کے داؤ سکھانے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ انگلستان میں ناولوں کی مارکٹ میں سرد بازاری آ گئی تھی اور مقبول ناولسٹوں کو کتابوں کی فروخت کی بجائے روپے کمانے کے دوسرے طریقے اختیار کرنے پڑ رہے تھے اس سے شیخ قربان علی کمار نے یہ اخذ کیا کہ سکھانے کا پیشہ قابل تضحیک نہیں۔ اس کی یہ سادہ لوحی تھی کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ ملک انگلستان نہیں ہے اور یہاں لکھنے والے کی حالت ناقابل رشک ہے۔ یہاں کوئی شخص ناول نویسی نہیں سیکھنا چاہتا کیونکہ فاقہ کشی کے اور بھی زیادہ سہل اور دلچسپ طریقے ہیں۔ اسی وقت سے جب قربان علی اس فلیٹ کا مکین ہوا اور وہ وقت تقریباً اس کی کراچی میں آمد کے وقت سے مطابقت کرتا ہے) اور جب اس نے بڑی

امیدوں سے یہ بورڈ پھاٹک پر لکھوا کر اپنی نئی زندگی کی ابتدا کی، اس کے پاس ایک بھی امیدوار ناولسٹ نہیں آیا تھا، یہ بیان سارے کا سارا سچ نہیں کیونکہ میں نے ایک بار قربان علی کٹار سے درخواست کی تھی کہ ناول نویسی سیکھنا چاہتا ہوں، اس نے اس کو ٹانگ کھینچنے پر محمول کیا۔ امیدوار ناولسٹ تو ایک طرف اس تین سال کے عرصہ میں قربان علی کٹار نے خود بھی ایک ناول نہیں لکھا تھا۔ جاسوسی ناول نویس فرمائش پر ناول تصنیف کرتا ہے اور جس شہر میں فرمائش کرنے والے تاجران کتب نہ ہوں، وہاں ادب کی یہ صنف کبھی پنپ نہیں سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ قربان علی اب اپنے ناول نہیں لکھ رہا تھا۔ وہ اپنے ناولوں کی زندگی جی رہا تھا اور اس کی زرخیز دماغی قوتیں ناول لکھنے کی بجائے سہ ماہی جنرل پلینیں بنانے پر استعمال ہو رہی تھیں۔

میں سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا تیسری منزل پر پہنچا جہاں دروازے پر نصب شدہ ایک تختی اس فلیٹ کے نمبر دس ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔ دروازہ کے اوپر ہی سفید چاک سے

ق ۔ ع ۔ کٹار
کالج برائے ناول نویساں

موٹے خوش خط حروف میں لکھا ہوا ہے۔ میں نے کنڈی کھٹکھٹائی اور تھوڑی دیر بعد سیاہ گاؤن اور چوکونی مستطیل ٹوپی میں ملبوس ایک پروفیسر قسم کے شخص نے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سرخ جلد کی کتاب تھی ۔۔۔" آکسفورڈ ڈکشنری " اس شخص نے بلا فریم کا چشمہ بھی پہن رکھا تھا۔

" کیا تم دودھ والے ہو،" قربان علی کٹار نے قدرے لڑکھڑاتے ہوئے کہا، " دیکھو بھئی! کل تمہارا سب پچھلا حساب چکا دوں گا۔"

پہلے میں نے سمجھا وہ بن رہا ہے لیکن پھر محسوس کیا کہ اس نے مجھے مطلق نہیں پہچانا۔

چشمے جو اس نے پہن رکھے تھے کسی بے حد منفی نظر کے بزرگ کے اُدھار مانگے یا چرائے ہوئے تھے اور اگر ان میں سے اُسے کوئی آدمی نظر بھی آتے تو وہ آدمی پانی میں تیرتے ہوتے تھے۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ وہ چشمے فی الواقع اصل پتھر کے تھے۔

"میں اس مذاق کو نہیں سمجھا" میں نے ذرا اس کی بات سے رنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اوہ! ارے تم ہو! چنگیزی" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "معاف کرنا میں سمجھا تھا دودھ والا ہے۔ وہ بڑا نامعقول اور بے مروت شخص ہے اور ہر روز اس وقت پچھلے حساب کے لئے آتا ہے ان چشموں میں مجھے بالکل نظر نہیں آرہا۔ اندر آجاؤ! وہ ابھی ابھی بالکونی پر آئی تھی۔"

میں اندر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کھڑکی کے سامنے جو نیچے مڈل وے اسٹریٹ پر کھلتی تھی ایک کرسی اور میز (جو میں نے اسے ادھار دے رکھے تھے) دیوار کے ساتھ میرا دیا ہوا بڑا ڈبل نواڑ کا پلنگ بھی تھا۔ باقی کمرہ سب فرنیچر سے خالی تھا۔ ناول نویسوں کے اُستاد کے کمرے میں آدمی کی آنکھیں کتابوں کی بے سُود تلاش کرتی تھیں، سوائے ایک کونے میں پڑے ہوئے رسالہ "اچھوتا خیال" کے پچھلے شماروں کے ڈھیر کے، ادب اس کمرہ سے مکمل طور پر جلا وطن تھا۔ شیخ قربان علی کٹار نے اپنے اسکول کے دنوں کے بعد (جب اس نے فضل بُک ڈپو کے ناول لکھے تھے) کبھی کچھ نہیں پڑھا تھا۔ وہ اُس کا صاف گوئی سے اقرار کیا کرتا تھا۔ اس کوتاہی کی صفائی میں یہ تھا ہر گز نا کہ قوت تخلیق خدا کی دین ہے۔ اور دوسروں کی کتابیں پڑھنے سے فن کار اپنے اسلوب کی جدت اور تازگی کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی گفتگو اس کے مطالعہ اور انشا پردازی کے ہولناک فقدان کی وجہ سے حددرجہ عامیانہ اور غیر ادبی ہوتی اور اس کی دماغی نشو و نما غالباً اس وقت رُک گئی تھی جب وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ مصنفوں کے ناموں تک سے اسے آشنائی نہ تھی اور اسے ان سے ایک ضد سی تھی اور وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار اپنے منھ بھلا کر ناک اُوپر چڑھا کرنے کے

ساتھ گلی میں جاتے ہوئے ایک بازاری گھٹیا کتے کے پاس سے گزرا ہو اور فوراً اللہ کہ کی طیبانہ غیر مہذب شکل پر کراہت اور تحقیر سے ناک چڑھا لیا ہو۔ شیخ کثار کے ناک سُڑکنے کے انداز میں ایک مغرور بورژوا بیت ۔ سی تھی۔ ایک امیرانہ سی نفاست اور وہ اپنے آپ کو مصنف کی حیثیت سے ایک قسم کا بورژوا یا یا رئیس تصور کرتا تھا اور دوسرے مصنفوں کو غض پر وتساریت کے افراد جن پر غض، ناک سڑکانا، چاہیئے جو تحقیر کے لائق بھی نہیں۔ جدید مصنفوں خصوصاً ان مصنفوں کے متعلق جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہلاتے ہیں، وہ ضرورت سے زیادہ زُود حس تھا اور اس کے باوجود کہ اس نے ان کی ایک سطر بھی نہیں پڑھی تھی، اُن کا نام سنتے ہی اس کے نتھنے پھول جاتے، ناک سُڑکنے لگتا اور کنپٹیوں تک خون دوڑ جاتا۔ ترقی پسندوں کا ذکر اس کے اعصاب کے حق میں مزر اور خطرے سے خالی نہ تھا، بلکہ ان مصنفوں کا ذکر بھی جو ترقی پسند نہ تھے اور جو کچھ خود شیخ کثار کی ملاس میں تھے اور اسی کے ناول پڑھ پڑھ کر ناول نویس ہوئے تھے (مثلاً چودھری نرگس ندا دی یا ایس۔ ایم۔ جلال) ـــــ ان کا ذکر بھی اس کے اعصاب کے لئے اتنا ہی ضرر رساں تھا اور خاص طور پر جلال کے نام پر تو اس میں مرگی کے دورہ کی سب علامات ظاہر ہو جاتیں یہ اس کی کیفیت کو حسد کا نتیجہ ہی بتا سکتا ہوں، دنیا اس کو، اصلی مصور فطرت، اصلی تھامس ہارڈی کو نظر انداز کر رہی تھی اور نئے ناول نویسوں کو جن کے ناول اس کے ناولوں کے مقابلہ میں دسواں حصہ بھی سنسنی خیز نہ ہوتے تھے، سر آنکھوں پر بٹھا رہی تھی۔ اس کے پُرانے خطاب، مصور فطرت، شاہ اسرار، تھامس ہارڈی، وغیرہ اب ان نئے نقالوں پر منڈھے جا رہے تھے اور ادیب ملت، کی کرسی پر جو دراصل اس کا حق تھی اب ایک جھوٹے دعویدار، کو متمکن کر دیا گیا تھا۔

اس کا حسد ایک فراموش شدہ جینیس، کا حسد تھا ـــــ تیز اور سیاہ حسد اور پھر بھی میری رائے میں اسے اس قدر زُود حس نہ ہونا چاہیئے تھا اس نے تین سال سے ایک ناول

بھی نہ لکھا تھا اور مصنف کے لئے شہرت کی روشنی میں رہنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم ہر تیسرے یا چوتھے مہینے چھپتا رہے اور اپنے قدردانوں کی یاد دہانی کراتا رہے کہ وہ ابھی ریٹائر نہیں ہوا۔ وقتاً فوقتاً اس کے افسانوں کا ملک کے مقبول ماہناموں میں بھی شائع ہوتے رہنا لازمی ہے۔ پبلک ایک عورت کی طرح بے وفا اور غیر مستقل مزاج ہے اور اگر شیخ قربان علی کو بھلا دیا گیا تھا تو یہ اس کا اپنا قصور تھا۔۔۔۔ ذرا تصور کرو! تین سال سے اس نے ایک ناول تک نہ لکھا تھا، ایک افسانہ بھی نہیں، جب کہ اس عرصہ میں حضرت ایس۔ ایم جلال کی مہینے میں دو کی اوسط تھی اور انہوں نے اردو ادب کو بہتر لافانی ہولناک، دلکش رونگٹے کھڑے کر دینے والے، رلانے والے، ہنسانے والے سہاگ کے بستر پر انگڑائیاں لیتے ہوئے نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے ناولوں کا ذخیرہ عطا فرما کر ہمیشہ کے لئے زیر بار احسان کر دیا تھا۔

"وہ سامنے۔ وہ ٹاٹ والی بالکنی والا۔ یہ اس کا گھر ہے" قربان علی کتار نے کہا "وہ بالکنی پر چار پانچ بار آ چکی ہے۔ اب تھوڑی دیر تک اسے پھر آنا چاہیئے۔۔۔۔ سگریٹ پیو۔"

اس نے بے حد فیاضی سے میز پر خالی ٹن کی طرف اشارہ کیا جسے میں متواتر دو ہفتے سے اسی طرح دیکھ رہا تھا۔

"اوہ! یہ خالی ہے؟!" قربان علی کتار نے گویا متعجب ہوتے ہوئے کہا "بھئی معاف کرنا۔ اب پیچھے سے ہی جا کر لانے پڑیں گے مگر میرا میاں سے ہلنا ٹھیک نہیں، وہ میرے پیچھے بالکنی پر ہو کر چلی گئی تو غضب ہو جائے گا۔ یار! ذرا تم ہی بھاگ کر نیچے سے سگریٹ لے آؤ ۔۔۔ دو بلیک اینڈ وائٹ اور دو پان۔"

"میں پیسے گھر بھول آیا ہوں" میں نے جواب دیا "مجھے چار آنے دو تاکہ میں نیچے سے سگریٹ پان لے آؤں۔"

شیخ قربان علی کتار کے چہرے پر تکلیف اور تشنج کی علامات ظاہر ہوئیں۔۔۔۔۔۔ اس نے یک لخت موضوع بدلتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

"آج میں سارا دن کہیں نہیں گیا۔"

"دفتر نہیں گئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے کہا "اور میں کل بھی نہیں جا رہا، پرسوں بھی نہیں جا رہا، اترسوں بھی نہیں جا رہا۔ بلکہ کبھی بھی نہیں جا رہا۔ میں دفتر کو خیرباد کہہ چکا ہوں۔"

میں اس پہ ہکا بکا ہو گیا اور تقریباً چلایا "دفتر نہیں جا رہے؟ نوکری چھوڑ رہے ہو؟ تو تم زندہ کیسے رہو گے؟"

"چنگیزی یار" اس نے مجھ پر اپنے اس اقدام کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے کہا۔ اس نے آرام کرسی پہ سے ٹانگیں میز کے اوپر پھینک دیں اور اس کے بوٹوں کے تلے میرے منہ کی طرف تکنے لگے۔ "بات یہ ہے کہ اس لباس میں میں دفتر نہیں جا سکتا۔ جنرل بلیمن کے مطابق ایک ہفتہ میرے لئے اس لباس کا پہننا لازمی قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہفتہ کے لئے میرا دفتر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہفتہ کے بعد (میں نے اندازہ لگایا ہے) میں اس عشق میں اپنے حریف دھنس چکا ہوں گا اور مجھے اپنی ساری توجہ اس طرف دینی پڑے گی۔ کسی قسم کا بھی دوسرا شغل اس وقت میرے حق میں مہلک ہو سکتا ہے، یکسوئی کامیابی کے لئے اشد ضروری ہے۔"

"یہ تو سب ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا "مگر پیٹ کا مسئلہ تم کیسے حل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

"..... میں نے اس معاملہ کو وقتی طور پہ سلجھا لیا ہے" اس نے کہا "اقبال میاں میں اکثر سوچتا ہوں" یہاں اس نے مجھے مشتاقانہ سچی دوستی والی نگاہوں سے دیکھا اور میرا دل نیچے ٹخنوں تک ڈوب گیا "..... میں اکثر سوچتا ہوں کہ دنیا کی سب نعمتوں سے بڑھ کر جو نعمت ہے وہ ایک سچا دوست ہے۔ مجھے خداوند تعالےٰ نے دوستوں کے معاملہ میں بے حد خوش قسمت بنایا۔ اگر اس وقت تم سا سچا دوست نہ ہوتا تو میں یک لخت یوں ملازمت

نہ چھوڑ سکتا۔ مگر اب کوئی پرواہ نہیں۔ ناشتہ کے لئے میں تقریباً اسی وقت بیکری پہ آجایا کروں گا جس وقت آج آیا تھا، دوپہر اور رات کو بھی میں چکر لگا سکتا ہوں لیکن اگر تمہارا ملازم یہاں کھانا پہنچا سکے تو مجھے سہولت ہوگی۔ کیونکہ دوپہر کو ایک دو بجے کے درمیان میرا یہاں رہنا لازمی ہے وہ اس وقت کالج سے لوٹتی ہے ــــ! آج مجھے پچیس روپیہ ادھار تو دو چنگیزی یار! دودھ والا گستاخ ہو رہا ہے اور کل مجھے دھوبی کو سامنے آتے دیکھ کر ایک پہلو کی گلی میں بھاگنا پڑا تھا۔ میں اب چاکی واڑا کے سب حساب چکا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں''....

میرے حلق سے ایک قسم کی کراہنے کی آواز نکلی۔ شیخ قربان علی کنار نے مسکرا کر پوچھا
"تمہارے پیٹ میں درد تو نہیں ہے۔؟"

"نہیں"، میں نے جیسے سرگوشی میں کہا "پھر بھی قربان علی، میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں مشورہ دوں گا کہ ملازمت نہ چھوڑو۔ آج کل ملازمتیں آسانی سے نہیں ملتیں اور پھر تم اس طرح کب تک رہ سکتے ہو۔"

"نہیں"، اس نے کہا "دو تین مہینے تو میں اپنے دوستوں کی وفاداری کا امتحان لینا چاہتا ہوں اور اس کے بعد جب رضیہ سے میری شادی ہو جائے گی اور ہم دونوں رشتۂ وصال میں منسلک ہو جائیں گے تو میرا ارادہ ہے میں اپنی ناول نویسی کے کیریر کا پھر سے آغاز کروں گا۔ کراچی میں نہیں تو لاہور سہی۔ اس فلیٹ کی ڈھائی ہزار پگڑی ملتی ہے اور یہ رقم ہمارے شروع شروع کے زمانے یعنی ماہ عسل وغیرہ کے اخراجات کے لئے کافی ہوگی۔ لاہور میں ناول نویسی کے لئے میدان پہلے سے کہیں وسیع ہو چکا ہے۔ ملگلے دن کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ تمہارا ایس۔ ایم۔ بلال لکھ کر پندرہ سو سے دو ہزار ماہوار تک کما لیتا ہے اور اس کا پبلشر صرف اس کے ناولوں کی فروخت سے لاکھوں کا مالک بن گیا ہے اور چودھری نرگس بغدادی نے صرف ایک ناول "ضیغم" سے چار ماہ کے اندر اندر سات ہزار روپے کمائے"

قربان علی کنار نے اپنے رقیبوں کا نام اس دفعہ ایک بے حد سہل تحقیر سے لیا اور پھر تلخی اور ناک چڑھانے کے بغیر، ورنہ وہ عموماً خود اپنی زبان سے ان دو مصنفوں کا نام تک زبان پر نہ لاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت کامیابی کے سپنے دیکھ رہا تھا۔۔ اپنی محبوبہ سے وصال، محرومی اور غربت کے سالوں کا خاتمہ، ایک نئی زندگی کا آغاز اور ادب میں اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کا حصول اس وقت اس پہ ایک خوش فہمی اور خوش اعتمادی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ وہ اپنے رقیبوں کو ان کی کامیابی اور ناجائز تعالی معاف کرنے کو بھی تیار تھا اور ان کے اقتدار کی مختصر گھڑی پر حسد نہیں کر رہا تھا۔ وہ لاہور میں جاتے ہی ہیجان انگیز اور سنسنی خیز ناولوں کی ایسی بوچھاڑ کر دے گا کہ ایس۔ایم۔جلال اور نرگس بغدادی میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، وہ بھاگنے سے پہلے اس کے وہ سارے القاب اس کو لوٹا جائیں گے جو انہوں نے اس سے چھین کر اپنے ناموں کے ساتھ لگالئے تھے اور اردو ادب کا حقیقی اور واحد تھامس ہارڈی پھر سے اپنے تخت پر جلوہ گر ہوگا۔ ماہنامہ "خیال نو" کا ایڈیٹر مولانا تاج حسین اپنے عالمانہ اور فصیحانہ طرز تحریر میں اس کے فن پر ایک لمبا مقالہ لکھ کر اس کی "تھامس ہارڈیٹ" کو مسلم کر دے گا (وہ مولانا تاج حسین جو ادب کا سب سے بڑا محاسب ہے اور جس کے دیئے ہوئے خطاب مستند سمجھے جاتے ہیں)!۔۔۔ کامیابی! کامیابی!

"میں نے اپنے نئے ناول کا پلاٹ بھی سوچ لیا ہے،" قربان علی کنار نے دمکتے ہوئے چہرے سے کہا، "مگر میں اس وقت تک اپنے رشحات قلم سے کاغذ سیاہ کرنے کو تیار نہیں جب تک کہ رضیہ میری نہیں ہو جاتی۔ چنگیزی یار! میری زندگی کی کامیابی اور اردو ادب کی قسمت کا دارو مدار اس عشق میں میری سرخروئی پر ہے۔ میرا نیا ناول "انسپکٹر شہباز خاں" "بدمعاش حسینہ" کی طرح ایک نئی چیز ہوگا۔۔۔۔"

مجھے شیخ کنار کو سالوں کی محرومی اور بانجھ پن کے بعد اس نئی امید اور نئے حوصلہ

سے اپنی ناول نویسی کا دوبارہ آغاز کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بڑے عرصہ کے بعد اس نے یہ ذکر کیا تھا اور میں نے سوچا کہ رضیہ کے عشق نے اس بجھے ہوئے شخص میں کتنا حیرت ناک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ وہ اب تقریباً ایک نیا آدمی ہے!
میں اس سے اس نئے ناول کے پلاٹ پر بحث کرنا چاہتا تھا (کیونکہ سچ تو یہ ہے یہ مرض متعدی تھا) اور یک لخت اس کی ٹانگیں میز پر سے نیچے چلی گئیں، وہ کرسی پر جھک کر بیٹھ گیا اور آکسفورڈ ڈکشنری کھول کر گویا مطالعہ میں غرق ہو گیا۔ میں یہ دیکھ کر کہ وہ کس قدر محنتی اور ٹوٹ قسم کا طالب علم نظر آرہا ہے مسکرائے بغیر نہ رہ سکا!

"چنگیزی یار۔ چنگیزی یار" اس نے گویا آکسفورڈ ڈکشنری میں سے پڑھتے ہوئے کہا "چنگیزی یار۔" ذرا بالکنی کی طرف تو دیکھو!"

میں نے کھڑکی میں سے مخالف مکان کی بالکنی کی طرف دیکھا جس پر برائے نام بوسیدہ ٹاٹوں کے پردے سے لٹک رہے تھے۔ ٹاٹ کے بڑے روزنوں کے پیچھے ایک سُرخ جھلک تھی ـــ عنابی سُرخ سی جھلک اور میری نبض بھی تیزی سے دوڑنے لگی ......اور پھر میں نے اس چہرے کو ایک شگاف میں سے صاف دیکھا جو چوڑے دریچے کی طرح ٹاٹ کی دیوار میں تھا اور اسے دیکھ کر میرے حلق میں جیسے پھانس سی لگ گئی ......اس کا حسن سانس روک دینے والا تھا..... کبھی کسی گدڑی میں ایسا نایاب اور آب دار لعل نہیں دمکا ہوگا ـــ کسی کنوارے باغوں میں کوئی پھول اس لطافت اور نزاکت سے نہ مہکا ہوگا... پڑھنے والے! یاد رکھ کہ یہ میں لکھ رہا ہوں، میں جو عام طور پر عورتوں کے حُسن کی کشش سے متاثر ہونے کی صلاحیت سے کورا ہوں ....
عورت رضیہ کا سن کوئی سترہ برس کا ہوگا۔ اس کے نقوش کھرے تھے اور ان میں ایک زرد ملاحت سی تھی جیسے اسے کسی یونانی سنگ تراش نے کسی قیمتی نازک چینی سے تیار کیا ہو۔ اس کے حُسن میں ایک ناپائیداری کا حزن تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر

وہ ذرا اگر پڑے سے تو بکنا چُور ہو جاتے پھول کو توڑنا اس کے حُسن کی لطافت کو مسلنا ہے، وہ ان
معدود سے بے مثال لڑکیوں میں سے تھی جن کی معصوم نزاکت، آدمی کی تُندفحش محبت کی تاب
نہیں لا سکتی اور جو اس کے بازوؤں میں جاتے ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے اپنی تازگی
اپنی خوشبو کھو دیتی ہیں (اور کون فحش مرد ایسی لڑکی سے وہ سلوک کرنے کی سوچ سکے گا) ! . . .
اور ان سب باتوں کے باوجود آدمی چاہتا تھا کہ اسے اپنے بازوؤں میں توڑ پھوڑ دے،
اس کے چہرے سے وہ محزون معصومیت کا پردہ پاک کر دے اور اسے ایک فحش چھنال
عورت میں تبدیل کر دے، اُس سے گندے مذاق کرے اور اس کی کبوتر سی سفید گردن کو
دانتوں سے کاٹ کر اس کا سُرخ میٹھا خون پیئے . . . . سب آدمی دل میں درندے ہوتے ہیں !
. . . وہ اپنی حسین قوم کا ایک تمثالی نمونہ تھی، اور اپنی نسل کی ایک سچی بیٹی۔ اگرچہ وہ شیخ کمار
کی معلومات کے مطابق مقامی لڑکیوں کے کالج میں الیف۔ اے میں پڑھتی تھی، جدید فیشن
نے اسے چھوا تک نہ تھا وہ ابھی تک اپنی قوم کے بھولدار جیغوں سے محبت کرتی تھی۔ نیموا
چھوٹے منہ کے اُوپر اس کی ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ اسی طرح لٹک رہی تھی جیسے اس کی
ماں اور دادی اور پر دادی کے ناکوں میں لٹکا کرتی ہو گی۔ اس کے سیاہ گھنے بال پیچھے دو
چوٹیوں میں گندھے ہوئے تھے اور چوٹیاں (میں نے دیکھا) اس کے کولہوں تک پہنچ رہی
تھیں اور سرخ موبافوں میں ختم ہوتی تھیں (اس کے ہماری سمت پیٹھ موڑنے پر چھیڑیں
نے دیکھا) . . . . میں جانتا ہوں میں اپنے آپ کو دہرا رہا ہوں مگر میں الفاظ میں ریکارڈ
کرنا چاہتا ہوں کہ لی مارکٹ کے قصاب کی بیٹی، یہ عورت رضیہ، حسین ترین لڑکی تھی
جسے میں نے بھی دیکھا . . . . . اس نے ایک بار ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ سے ہماری طرف
دیکھا اور مجھے اس طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر ایک گہری سُرخ تمتماہٹ اس کے چہرے
پر دوڑ گئی۔ ایک تمتماہٹ، غصہ کی یا شرم کی، یہ میں نہیں کہہ سکتا اور اس نے کچھ گھبراہٹ
میں اپنی پیٹھ ہماری طرف پھیر لی (تبھی میں نے وہ چوٹیاں دیکھیں جن کا میں نے اوپر ذکر

کیلئے) اور اس طرح وہ شام کے گہرے جھٹپٹے میں دیر تک کھڑی رہی، قربان علی نے اب آکسفورڈ ڈکشنری سے آنکھیں اٹھا لی تھیں اور میرے خیال میں اس موقعے کے دوران میں پہلی بار اس نے اپنے محبوب پر نظر ڈالنے کی ہمت کی۔ محبوب کی پیٹھ کو دیکھنا اس کے چہرے کو دیکھنے سے زیادہ محفوظ تھا۔ کیونکہ چہرے کے ردِ عمل کے متعلق کچھ پیش گوئی نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ کیا ہوں گے، پیٹھ ہمیشہ ایک مہربان حسین محبوب کی پیٹھ تھی.... پا کسی نے رضیہ کو اندر سے آواز دی "بیٹی!" اور وہ اندر چلی گئی!

شیخ کٹار نے مجھے مغرور سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اتنے بے مثال محبوب کا عاشق بننے پر متوقع تھا کہ میں اس کی پیٹھ ٹھوکوں گا۔ وہ اتنا مغرور نظر آتا تھا جیسے رضیہ کے حسن میں اس کا کچھ ہاتھ ہو۔

"خوب چیز ہے!" میں نے کہا "میں تمہیں اس خوش ذوقی پر مبارک باد دیتا ہوں.... مگر صاف صاف بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری کامیابی بے حد مشکل نظر آتی ہے۔"

"کامیابی مشکل نظر آتی ہے!" اس نے جواب دیا "چنگیزی میرے یار! تم ہمیشہ میری حوصلہ شکنی کرتے ہو۔ مجھے آج تک یاد نہیں کہ تم نے کبھی کسی معاملہ میں میری حوصلہ افزائی کی ہو.... میں تمہیں بتا دوں کہ اس دفعہ میری ناکامیابی ناممکن ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیسے میری جنرل پلین مجھے سیدھی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچا دے گی۔ جنرل پلین بالکل مکمل ہے۔"

"تمہاری جنرل پلین" میں نے کہا "میں مانتا ہوں کافی قابلِ تعریف ہے مگر یہ بہت زیادہ کتابی ہے اور تمہارے کئی ایک استنباط کی درستی میں مجھے کچھ شک ہے۔ مثلاً یہی کہ تمہارے کہنے کے مطابق اس لڑکی نے کہیں کہا ہے کہ وہ ایک پروفیسر سے شادی کرے گی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہاری اس معلومات کا سرچشمہ کون ہستی ہے؟"

"میرے استنباط سب درست ہیں اور تحقیق پر مبنی ہیں" قربان علی کٹار نے جواب دیا۔

"یہ تو تم جانتے ہو کہ میرے محترم چچا حاجی عبدالکریم کی بیٹی اس رضیہ کی سہیلی ہے اور وہ اسی گرلز کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے۔ میں نے اسے کئی دفعہ ان کے گھر بھی آتے جاتے دیکھا ہے۔ اس سے مجھے رضیہ کی کئی باتیں معلوم ہوتی رہی ہیں اور جنرل پلین کی کامیابی میں مجھے اپنی چچیری بہن کی امداد اور معاملہ فہمی پر مکمل بھروسہ ہے۔"

یہ پہلی بار تم نے مجھے بتایا ہے کہ تم کسی کے بھتیجے بھی ہو، میں نے کہا اور یہ کہ تمہاری ایک چچازاد بہن بھی ہے جو اس معاملہ میں دلچسپی لے رہی ہے اور تمہاری پشت پر ہے۔ اب میں تمہاری کامیابی سے اس قدر نا امید نہیں۔ اگرچہ تمہاری جنرل پلین، سب سے اہم چیز کو بالکل نظر انداز کر رہی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ اس میں رضیہ کے باپ سے بات چیت کرنے کی بابت کوئی ذکر ہے۔ میں نے تمہیں تمہارے پہلے معاشقوں میں۔ بھی یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس ملک میں لڑکی کو جیتنے سے اس کے والد کو جیتنا زیادہ ضروری اور اصل چیز ہے۔ اگر والد کی رضامندی حاصل کر لی جائے تو گویا قصہ ہی طے ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں اس اہم مسئلہ پر۔ تمہاری جنرل پلین خاموش ہے۔"

رضیہ کے باپ کے ذکر پر قربان علی کثار کا چہرہ لٹک گیا اور ایک اُداس، سوچنے والی نظر، اس کی آنکھوں میں آ ئی۔

"میں اس معاملے میں بوڑھے قصاب کے بغیر کامیاب ہونے کا ارادہ کر چکا ہوں!" اس نے تلخی سے کہا، "قصاب کا ذکر مت کرو۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے کثار"، میں نے اسے سمجھایا، "تم ایک شخص کی لڑکی سے شادی کے خواستگار ہو اور اس شخص سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر یہ شادی روحانی قسم کا معاملہ ہے تو پھر شاید لڑکی کا باپ تو کیا بلکہ لڑکی کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن اگر تم اس لڑکی سے عام مفہوم کے مطابق شادی کرنا چاہتے ہو۔۔۔ یعنی تم میرا مطلب سمجھتے ہونا۔۔۔ تو تمہیں اس کے باپ پر اپنا ارادہ ظاہر کرنا ہی پڑے گا۔"

میں لڑکی کے والد کو معاملے کے بیچ میں لانے کی ہچکچاہٹ جو کٹار کو ہو رہی تھی۔ کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔۔۔۔ وہ اس قسم کا شخص نہیں جسے کوئی اپنی دامادی میں لینے کے بارے میں سوچ سکے اور جسے کوئی اپنی بیٹی سے نواز سکے، عام دنیاداری کی علیک سلیک کے علاوہ لوگوں کے دل میں گھر کرنے کے فن سے مطلق بے بہرہ تھا اور پھر نہ اس کے کوئی رشتہ دار تھے نہ آگا، پیچھا، اور نہ ہی کوئی مستقل پیشہ ایسے شخص کو کوئی پاگل ہی اپنی بیٹی دے دینے پر راضی ہو سکتا تھا۔۔۔ اور رضیہ کا باپ کوئی معمولی باپ نہ تھا (یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا) ایک بے حد مغلوب الغضب اور خونخوار ہستی جیسا کہ ایک سچا قصاب ہوتا ہے۔ اس سے اس کی لڑکی کے رشتہ کے لئے درخواست کرنا گویا مرکھنے سانڈ کو سُرخ کپڑا دکھانے کے مترادف تھا، کوئی بھی نوجوان جسے اپنی جان کچھ تھوڑی بہت عزیز تھی، اس جسارت کے مرتکب ہونے کا وہم و گمان نہیں کر سکتا تھا (غالباً یہی وجہ تھی کہ رضیہ ابھی تک کنواری تھی!)۔۔۔ مگر یہ بھی ظاہر تھا کہ قصاب کی رضامندی کے بغیر شیخ قربان علی کٹار کی قابلِ تعریف جنرل بلیبن بے فائدہ اور لاحاصل تھی!

"دیکھو کٹار" میں نے کہا "میں تمہارا سچا دوست ہوں اور میں اس معاملہ میں تمہاری مدد کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ رضیہ کے آجانے سے تمہاری زندگی بالکل بدل سکتی ہے، تمہاری خاطر میں اس قصاب سے دوستی اور جان پہچان پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔۔۔۔۔۔ تم بیٹی کو جیتو اور میں باپ کو ــــــ باقی رہی جنرل بلیبن! تو تم اسے بھاڑ میں جھونک سکتے ہو۔" "تم حقیقتاً میرے واحد دوست ہو!" قربان علی کٹار نے کہا:

"اب آٹھ بجے ہوں گے۔ آؤ تمہیں چھوڑ آؤں۔ بکری تک چھوڑ آؤں اور کھانے کا ٹنٹا بھی نکال آؤں۔ مجھے واقعی بھوک لگ آئی ہے۔ دوپہر کو کچھ نہیں کھایا تھا۔۔۔۔۔۔ آج تو چنگیزی یار کوئی مرغِ مسلّم وغیرہ

کھلاؤ.....“

اور، ہم اکٹھے سُرمئی رات میں باہر سڑک پر اُتر آئے۔ اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیکری کی طرف چلنے لگے۔ اب میرے دل میں شیخ قربان علی کنار کے خلاف ذرہ بھر آزردگی نہ تھی اور اگر اس وقت وہ مجھ سے میری آخری بچی ہوئی قمیض بھی مانگتا تو میں خوشی سے اسے اُتار کر اس کے حوالہ کر دیتا.....

جنرل پلین کی رُو سے پورے ہفتہ تک شیخ قربان علی کنّار "پروفیسر" بنا رہا اور اس عرصہ کے خاتمہ تک وہ گاؤن اور چوکور ٹوپی سے اس قدر جذباتی دل بستگی پیدا کر چکا تھا کہ اس نے اس فاضلانہ خلعت کو اپنا معمول کا لباس بنا لیا۔ وہ اس کو صبح سے رات تک پہنے رکھتا اور (اگرچہ میرے پاس اس امر کے متعلق کوئی قطعی شہادت نہیں) سوتا بھی اسی میں تھا۔ یہ بہروپیوں کا سا لباس کسی اور شہر میں اپنے پہننے والے کو ایک قسم کی شہرت اور لوگوں کی توجہ دلانے کا موجب ہوتا، بجا کی واڑا میں جہاں خارج العقل کپڑوں اور عادات والا شخص بھی لوگوں میں صرف ایک سطحی دلچسپی اُبھار سکتا ہے، پروفیسر کو پہلے ایک نئے پرندے کی سی حیثیت سے مدھم تعجب سے دیکھا گیا اور بعد میں بھلا دیا گیا۔ پھر بھی میرے خیال میں، یہ خلعت کنّار کی زندگی میں تھوڑی سی دلچسپی ضرور لے آیا۔ گلیوں کے بچے اس کے پیچھے تالیاں بجاتے ہوئے بھاگتے —— اس کو ایک عجیب قسم کا اُلّو سمجھتے ہوتے جو اپنی ٹانگوں پر چلتا تھا، بعض اس کو خوف اور تعجب سے دیکھتے اور اسے کوئی جادوگر یا جن وغیرہ سمجھ کر گھروں کے اندر گھس جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام اس کے ساتھ مڈل وے اسٹریٹ سے گزرتے وقت میں نے ایک چار سالہ بڑے سر اور لمبے کانوں والے لڑکے کو جو ایک دُبلے زرد رو شخص کی انگلی پکڑے تھا، اپنے بڑے ساتھی سے دبے لہجہ میں پوچھتے ہوئے دیکھا "انکل! یہی وہ کاؤنٹ ڈراکولا ہے، جس کی کہانی آپ نے مجھے سنائی تھی"...... اور ایک دفعہ کارپوریشن اسٹریٹ میں سے گزرتے وقت ایک ہیر کٹنگ سیلون میں سے حجام اور ان کے گاہک دوڑتے ہوئے ہمیں دیکھنے

گے ہئے باہر نکل آئے حجاموں کے ہاتھوں میں اُسترے تھے اور گاہکوں کے منہ صابن کے جھاگ میں ملفوف تھے اور یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ حجامت کئے جانے کے عمل میں اُٹھ کے بھاگ گئے تھے۔ (صابن میں ملفوف آدمی کٹار کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے، جس کے نتیجے کے طور پر تھوڑا سا صابن ان کے منہ کے اندر گھس گیا)

شیخ کٹار کی اس "پروفیسریت" نے اس کی عاشقانہ اُمنگوں کی تکمیل میں کہاں تک معاونت کی؟ آیا اس سے ویسا ہی خاطر خواہ نتیجہ نکلا جیسا وہ چاہتا تھا۔ کیا اس کی محبوبہ اس کے عالمانہ خلعت، اس کے کتابی کیڑے والے انداز سے، مناسب طور پر متاثر ہوئی اور پروفیسر کے لئے اس کے سینے کے دل میں ہمدردی یا دلچسپی کا کوئی دیا فروزاں ہوا؟ ان سوالوں کا جواب کون دے سکتا ہے۔ ہمارے پاس جاننے کا کوئی طریقہ ہی نہ تھا۔ ... ممکن ہے۔ اس ہفتے کے اندر شیخ قربان علی کٹار ایک محنتی پروفیسر کی حیثیت سے اس کی نگاہوں میں ایک جداگانہ وجود رکھنے لگ گیا ہو، ممکن ہے کہ اس ہفتے کے بعد یہ اچھی طرح دیکھ کر "بعض پروفیسر کیسے ہوتے ہیں اس نے پروفیسر سے شادی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہو اور پروفیسر کی زوجیت گھناؤنا نفرت انگیز تخیل بن گیا ہو۔ ... جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، بدقسمتی سے ہمارے پاس اس کی دلی کیفیت معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ جہاں تک شیخ قربان علی کی جنرل پلین میں "ایک۔ ہفتہ۔ پروفیسر نو" والے اقدام کا تعلق تھا۔ اس کا نتیجہ مایوس کن نہ تھا۔ اس پہلے اقدام کا مدعا محض اسی قدر تھا کہ محبوب جان لے کہ

۱۔ شیخ کٹار پروفیسر ہے۔

۲۔ کہ وہ مطالعہ کا بے حد شوقین ہے۔

۳۔ کہ اس کا دوسرے انسانوں سے ایک جداگانہ وجود ہے اور یہ مدعا غالباً پورا ہو چکا تھا۔ رضیہ نے کٹار کو اس سارے ہفتے میں گاؤن اور ٹوپی میں دیکھا تھا، اس نے اسے ہمیشہ نمائیت کے دقیق انداز میں اپنے کمرے میں ایک موٹی سرخ کتاب کا مطالعہ کرتے پایا

تھا اور اگر کوئی لڑکی برابر ایک ہفتہ کسی شخص کو فاضلانہ خلعت میں ملبوس، مطالعہ میں منہمک دیکھتی رہے اور اگر وہ شخص قربان علی کٹار ہو، تو یہ قرین قیاس ہے کہ وہ شخص اس لڑکی کی نگاہوں میں ایک خاص منفرد ہستی بن جائے گا اور وہ عام معمولی آدمی نہیں رہے گا۔ قربان علی نے بھی اپنی پلین کے اس پہلے اقدام کے لئے اس سے زیادہ دعویٰ نہیں کیا تھا اور میں یہ کہوں گا کہ پلین کے مطابق پہلے مرحلے کو ناکامیاب نہیں کہا جا سکتا تھا۔

پھر بھی (جنرل پلین کو بھول جائیے) اب تک نتیجہ صفر تھا اسے چھوڑ کر کہ محبوب کا صحیح ردعمل کیا ہوا اور آیا کہ اس نے رات کو تارے گننے شروع کئے یا نہیں اور آیا کہ اس نے بالم کو خواب میں دیکھنا شروع کیا یا نہیں (بالم چشمہ اور گاؤن میں، اور اپنے سامنے آکسفورڈ ڈکشنری رکھے) ــــ یہ چھوڑ کر کہ عاشق اور محبوب ایک دوسرے سے اتنے ہی دور تھے جتنے اس عشق کے آغاز پہ۔ مڈل وے اسٹریٹ کی چوڑائی (تقریباً پندرہ فٹ) اسی طرح ان کے درمیان حائل تھی.... چاکی واڑا میں بعض جگہ اور کراچی میں ہر جگہ واحد قسم کا عشق جو ممکن ہے وہ بالکونی کا عشق ہے ــــ میرا مطلب ہے اس عشق سے جس میں عاشق اور محبوب اپنی اپنی فلیٹوں کی بالکنیوں میں کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر عشق فرماتے ہیں۔ اس عشق کی تکنیک دوسرے تمام قسم کے عشقوں سے مختلف اور مشکل ہے اور یہ قابل افسوس ہے کہ اب تک اس بالکونی عشق پر کسی ماہر فن نے کتاب لکھنے کی توجہ نہیں کی۔ امریکی ماہرین فن نے عشق کو مبتدیوں کے لئے سہل اور بار آور کرنے کے لئے کئی ایک مفید کتابیں تصنیف کی ہیں "کیا تمہارا "بیو" ہے؟" "محبت میں کامیابی کے چند سنہری اصول" "گلی کے موڑ پہ کھڑی ہوئی لڑکی تمہاری ہو سکتی ہے" "عشق کا شارٹ کٹ" اور مجھے کسی نے بتایا ہے کہ کئی انسٹی ٹیوٹ اس کار آمد موضوع پہ خط و کتابت کے ذریعہ کورس کراتے ہیں اور کامیابی نہ ہونے کی صورت میں فیس واپس کرنے کی گارنٹی دیتے ہیں.... لیکن امریکی ماہرین نے جو ہر ایک چیز کو مکمل جامعیت اور کاملیت سے لیتے ہیں،

اپنی کتابوں میں "بالکونی عشق"، کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ غالباً وہ اس لحاظ سے پیچھے ہیں کہ امریکہ میں بالکونی "ڈیٹیز عشق"، ہوتا ہے انگلستان میں بھی وکٹوریہ کی موت کے بعد "بالکونی عشق"، غیر ضروری اور متروک سا ہوگیا ہے۔ اس کے برعکس اس ملک میں واحد قسم کا عشق جو ممکن ہے وہ بالکونی عشق ہے اور کم از کم نصف صدی تک یہی عشق چلے گا۔۔۔ مگر صحیح راہنمائی اور ہدایات کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایسے عشق کے نتائج جانبین کے لئے عموماً غیر تشفی بخش اور بعض حالتوں میں ہولناک ہوتے ہیں۔ جانبین میں سے بہت کم ابھی تک گلی کی وسعت کو عبور کر سکے ہیں، بعضوں کے بازو اور ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں، کئی ایک گنجے ہوگئے ہیں ایسے عاشق عموماً ناپختگی اور تجربہ کے فقدان کی بنا پر محبوب کے باپ یا بھائیوں کے وجود کو بھلا بیٹھتا ہے جو عاشقوں کے جانی دشمن ہوتے ہیں اُس کے لئے اور سب سے بڑی رکاوٹ (بعض محبوبوں کے باپ نوکیلے کیلوں والے بوٹ پہنتے ہیں!) ایک اور مصیبت بالکونی عشق میں یہ ہے کہ یہ سو میں سے نوے صورتوں میں یک طرفہ ہوتا ہے اور اس میں محبوب یا تو بے خبر ہوتا ہے یا بے اعتنا یا مستعد طور پر معاندانہ (وہ مخالف پارٹی میں ہوتا ہے یا ہوتی ہے ــــ اپنے باپ اور بھائیوں کی پارٹی میں)۔۔۔ اندریں حالات میری ناچیز رائے میں بالکونی عشق پہ ایک مستند کتاب کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ایک قومی خدمت ہوگی اور اگر کوئی اس فن کا ماہر اپنے تجربہ کا نچوڑ، دوسرے راہ گذروں کے استفادہ کے لئے صاف اور ٹو۔ دی۔ پوائنٹ نثر میں لکھ دے تو اس کتاب کی مانگ لاکھوں تک ہوگی (مجوزہ ٹائیٹل، بالکونی والی لڑکی تمہاری ہو سکتی ہے!)

قربان علی کتانے کے عشق کی صورت میں، گو رضیہ ایک بار اپنی بالکونی پہ بھی آئی تھی۔ اور اس نے ایک دو دفعہ اُچٹتی نظر سے اس کے فلیٹ کی طرف بھی اپنی ہرنی کی سی آنکھوں سے دیکھا تھا اور یہ بھی غالباً سچ ہے کہ اس کی آنکھوں میں کوئی تمسخر

انگیز حقارت نہ تھی (وہ آنکھیں اس کی نااہل تھیں) بلکہ ایک طرح کی ترحمانہ دلچسپی اور
مادرانہ تردد کا امتزاج سا تھا۔ پھر بھی اس نے نگاہ یا اشارہ سے اس بات کا اظہار نہ کیا تھا۔
کہ وہ رضامند ہے یا یہ کہ اسے اس فلیٹ کے مکین سے کوئی غیر معمولی دلچسپی ہے۔ دراصل
وہ اس قسم کی لڑکی تھی جو اصیل اور باعفت، اپنے باپ کی چھت کے نیچے اس وقت
کا انتظار کرتی ہے جب اس کا باپ اس کو اپنے گھر کی چھت کے نیچے دیکھنے سے سیر ہو کر
اس کا ہاتھ ایک اجنبی خاوند کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ وہ یقیناً اپنی عمر کی تمام لڑکیوں
کی طرح "رومان" کی خواستگار ہوگی اور اس کی کھوئی کھوئی محزون نگاہیں یقیناً رومان
کی متلاشی اور بھوکی تھیں۔ مگر رومان اس کے باپ کے ہاتھ میں تھا۔

اس وقت اس کے ردِ عمل اور تخیلات کے بارے میں شاید اس کی سہیلی، قربان علی
کٹار کی چچی زاد بہن سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ وہ انہی دنوں کٹار کے
چچا کے ساتھ رشتہ داروں کے ہاں کچھ عرصہ کے لئے ملتان چلی گئی تھی۔ حقیقتاً کٹار اس
چچا زاد بہن کی امداد اور معاملہ فہمی پر بہت حد تک دارومدار رکھ رہا تھا اور اس کا اس
طرح اس عشق کے بیچ میں چلا جانا جنرل پلین کے سراسر خلاف تھا۔ اس کی امداد سے
معاملے کو سلجھانا پلین کی کامیابی کا ایک لازمی حصہ تھا اور وہ پلین کی "ہیملٹ" میں ڈنمارک
کا شہزادہ تھی۔ اپنے جانے سے اس نے پلین کو بالکل چوپٹ کر دیا اور پہلے اقدام کے
بعد دوسرے اقدام کو اب بالکل بدلنے اور دوہرانے کی ضرورت تھی۔

مجھے قربان علی کٹار کے فلیٹ کی وہ شامیں اچھی طرح یاد ہیں۔ میں کرسی پر کھڑکی کی
طرف منہ کئے بیٹھا ہوا، اور کٹار آرام کرسی میں دراز ٹانگیں میز پر پھیلائے اور اپنی عینک
کے شیشوں کے اوپر سے مجھے دیکھتا ہوا۔ درمیان میں کھلی ہوئی آکسفورڈ ڈکشنری اس کی گود میں
پڑی ہوتی۔ ہم خوب باتیں کرتے اور آسمان کے نیچے جو بھی چیز ہے اس کو زیرِ بحث لاتے۔
مگر جس وقت وہ بالکنی کے پیچھے آ جھلکتی ہماری فلسفیانہ گفتگو فوراً ختم ہو جاتی۔ ایک سناٹا

ہم پر طاری ہو جاتا جیسے ہمیں سانپ سونگھ گیا ہو (یا بقول میرے ایک ہیڈ ماسٹر کے جیسے ہم نے سانپ سونگھ لیا ہو) ہماری نبض تیز ہو جاتی اور دل زور زور سے سینے کی دیوار پر ہتھوڑا چلانے لگتا ۔۔۔ شام کا جھٹپٹا گہری تاریکی میں بدلنے لگتا اور پھر کٹار اور میں چپکے سے فلیٹ سے اُتر کر بیکری کی طرف مرغ مسلّم کھانے چلے جاتے ۔ عموماً ہم دونوں فلیٹ پر اکیلے ہوتے اور بعض دفعہ ہمارے ساتھ ایک تیسری ہستی بھی ہوتی ۔ یہ تیسری ہستی ایک مٹیالے رنگ کا چھوٹی ٹانگوں والا کتا تھا ۔۔۔ ایک اُونی سا گولا جس کی آنکھیں بٹنوں کی طرح گول اور ننھی تھیں اور جس کے کان اس کے باقی جسم کے لحاظ سے بے حد لمبے تھے اور اس کے چہرے کے ساتھ سیدھے استری کئے ہوئے معلوم ہوتے تھے ۔ یہ معصوم ترین اور غلیظ ترین کتا تھا جس کا مجھے کبھی دیکھنے کا اتفاق ہوا اس کی خاندانی تاریخ نامعلوم تھی کسی کو پتہ نہ تھا کہ اس کے مورث کہاں سے پہلے پہل آئے اور اس کی نسل کونسی تھی! شیخ کٹار کے خیال میں وہ دراصل ایک معزز کاکر اسپنیل تھا جس کا آقا مر چکا تھا ۔ یا اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا اور اس پر بڑے دن آ گئے تھے اور وہ گلیوں میں ٹکڑوں پر جینے کے لئے مجبور ہو گیا تھا ۔ شاید شیخ کٹار ٹھیک ہی کہتا ہو اگرچہ وہ ہر ایک کتے میں کاکر اسپنیل ہی دیکھتا ہے (ایک دفعہ لی مارکٹ کے پاس اس نے ایک بڑے بڑ والے جغادری السیشن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " دیکھو چنگیزی یار ! کتنا قد آور کاکر اسپنیل ہے) یہ اُونی کتا جو کسی کھلونے کی دوکان سے فرار ہوا لگتا تھا ، شیخ کٹار کا کتا نہ تھا ، اس کا یہ رویہ ایک کتے کے لئے بے حد ناقابل فہم اور پُراسرار تھا ۔ وہ کئی دفعہ چپکے سے روشنی اور گرمی اور انسانی دوستی کی تلاش میں اُوپر کٹار کے فلیٹ میں آ جاتا اور اپنے پُٹھوں پر بیٹھ کر اپنی دُم ہلاتا اور ہمارے چہروں کا مطالعہ کرتا رہتا ۔ اور پھر چپکے سے غائب ہو جاتا ۔ میں اور کٹار اس سے کبھی کبھی لاڈ کرتے اور اس کی اگلی دو ٹانگیں پکڑ کر اسے کھڑا کرتے اور ناچنے کی مشق کراتے ۔ کٹار تو اسے کبھی کبھی گود میں بھی

اُٹھالیتا مگر وہ بے حد غلیظ تھا۔ کٹار سے اس کی واقفیت صرف چند ماہ کی تھی۔ اس نے اسے ایک روز اپنی فلیٹ کی عمارت کی سیڑھیوں پہ اکیلا اُداس بیٹھا پایا، اسے یونہی پچکارنے کے بعد جب کٹار اُوپر چڑھا تو کتے نے اس کا پیچھا کیا . . . کٹار اُسے 'مسافر، مسافر' کہہ کر پکارتا، اس نے یہ نام کیوں اس کتے پر رکھا مجھے آج تک معلوم نہیں ہوا — ہاں ایک طرح وہ مسافر اس معنی میں ضرور تھا کہ اس کے آنے اور جانے کا کوئی پتہ نہ تھا اور وہ ظاہراً ایک دسترخوان پر قانع رہنے کا قائل نہ تھا (شیخ کٹار کے فلیٹ پہ دسترخوان کا سوال ہی نہ تھا)

ان شاموں کی صحبتوں کی روئداد میرے روزنامچہ میں مکمل درج ہے "ریموٹل پیپس" کی طرح میں چار سال سے ایک مفصل ڈائری رکھنے کا عادی ہوں، اور مجھے اُمید ہے کہ مستقبل میں بیاکی واڑا کے مورخین کو اس شہر کی سماجی تاریخ مرتب کرتے وقت، میری ڈائری (اگر وہ وقت کی دست بُرد سے محفوظ رہ سکی ہے) گراں قدر مدد ملے گی۔

مگر جوں جوں شامیں گزرتی گئیں میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ ہمارے اقدام شیخ کٹار کو اپنی منزل مقصود کے ذرہ بھر قریب نہیں لا رہے۔ اس کی کملا ئی محبوبہ ابھی تک اور اتنی ریاضت کے باوجود اس کی بیوی بننے کے لئے پہلے روز کی طرح دور تھی اور نہ ہی ظاہراً کٹار کی خواہشات کے پورا ہونے کا کوئی احتمال تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ کچھ اور مستعدی سے اس معاملہ میں عمل کیا جائے اور زیادہ موثر اور محسوس طریقے اختیار کئے جائیں جبل پلین، اب ردی ہو چکی تھی اور خود کٹار نے اقرار کر لیا تھا کہ اس کی چچا زاد بہن کے چلے جانے کے بعد اس کے بعض حصے بے معنی اور بے کار ہو گئے تھے . . . . میں نے اور کٹار نے کئی نئے طریقوں پر بحث کی جنہیں کسی نہ کسی وجہ سے ناقابل عمل اور خطرناک سمجھ کر چھوڑ دینا پڑا۔ مثلاً ایک تجویز کٹار نے پیش کی کہ رضیہ کو ایک خط لکھا جائے جس میں اسے بتایا جائے کہ ایک بدنصیب اس کے فراق میں لب گور ہو چکا ہے اور جُوں جُوں دوا کی جاتی ہے مرض بڑھتا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک تجویز میری تھی کہ مسافر کو سدھایا جائے اور اسے

ایک دوسرے کی طرف نامہ و پیغام بھیجنے کے لئے قاصد کے طور پر استعمال کیا جائے .....
لیکن ان دونوں تجویزوں میں خطرہ یہ تھا کہ رضیہ کو جو خط یا پیغام جائے گا اس کا اس کے باپ کے ہاتھوں میں پڑنا بے حد اغلب تھا۔ شیخ قربان علی نے اپنے ناولوں سے ایک نہایت دلبرانہ تجویز پیش کی جس نے ہمیں اس درجہ مضطرب اور مسحور کر دیا کہ اس کو رد کرنے سے پیشتر ہم دو گھنٹے بحث کرتے رہے۔ وہ تجویز یہ تھی کہ رضیہ کے صبح کالج جاتے وقت میں نقاب پوش ولن کے روپ میں اس کی گاڑی میں چڑھ جاؤں اور اس کو جھوٹ موٹ پکڑ کر اپنے سینے سے چمٹانے کی کوشش کروں۔ اس وقت قربان علی کنار ایک معصومہ کی عفت پر ڈاکہ پڑتے دیکھ کر گاڑی میں چڑھ آئے اور میرے منہ پہ ایک ایسا زنائے دار مکا رسید کرے کہ میں چلتی گاڑی سے باہر لڑھکتا جا پڑوں۔ اس تجویز کو بعض تکنیکی وجوہات کی بنا پہ مسترد کرنا پڑا...
اب میری رائے میں ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا وہ یہ کہ رضیہ کے باپ قصاب سے براہ راست رشتہ کی بات کی جائے (اگرچہ اس طریقے کے خطرات واضح تھے!)
اور ایک رات میں نے شیخ قربان علی کنار کو بڑی مشکل سے اور اس کی مردانگی کی غیرت دلا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ قصاب کے پاس جا کر اس سے خود درخواست کرے کہ وہ اس کی دامادی کا آرزومند ہے۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں" میں نے اسے سمجھایا۔ "وہ انکار نہیں کرے گا بلکہ خوشی سے رضامند ہو جائے گا۔ آخر آج کل پروفیسر داماد کہاں ملتے ہیں ـــــ مرد بنو کنار! ڈرپوک مت بنو! اس کے پاس جاؤ اور ڈو بڈو ہو کر اس سے کہو کہ اے قصاب! یا جو کچھ بھی اس کا نام ہے۔ میں تیری دختر سے شادی کا خواستگار ہوں۔ میں پروفیسر ہوں۔ مجھے یقین ہے تجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا..." اگر تم یہ الفاظ پوری خود اعتمادی سے کہو تو وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔ لوگ ایسے داماد پسند کرتے ہیں جن میں خود اعتمادی ہو ارے بھئی کانپتے کیوں ہو۔ میں خود تمہارے ساتھ ہوں گا۔ اور اگر کوئی غیر متوقع بات ہو بھی گئی تو تم مجھ پہ بھروسہ کر سکتے ہو"!

"یہ جنرل پلین میں نہیں ہے" ، اس نے عذرداری کی۔

"جنرل پلین جائے بھاڑ میں!" میں نے کہا۔ "اس کو پھاڑ دو! اسے آگ میں جھونک دو — میرا مطلب ہے اگر تم بھی آگ جلاتے ہو تو — کہاں ہے اس کا بلیو پرنٹ"، میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لاؤ مجھے دو۔ میں اسے بیکری کی بھٹی کا ایندھن بناؤں گا۔"

"یہ میرے دماغ میں ہے" کٹارے نے اپنا ہاتھ اپنے دماغ تک لے جاتے ہوئے کہا۔

"دوست کٹارے! میں تمہاری مدد کروں گا"، میں نے بہادری سے کہا اگرچہ میری آواز کچھ بھرائی سی تھی اور میں اپنے دل میں اس شخص کی طرح عالی ظرف اور ایثار کرنے والا محسوس کر رہا تھا جو اپنے نااہل دوست کے لئے ایک ایسی قیمتی چیز کی قربانی دے رہا ہو جو استحقاقاً اس کی اپنی ہو۔ "میں رضیہ کے باپ سے آشنائی پیدا کروں گا۔ اسے دوست بناؤں گا اور پھر آہستہ آہستہ اسے جتلاؤں گا کہ میرا ایک ناولسٹ دوست کنوارا ہے اور اس کی لڑکی میں دلچسپی رکھتا ہے۔"

کٹارے کا رنگ فق ہو گیا۔ "خدا کے لئے ایسا مت کرنا"، اس نے کہا۔ "ہمیں رضیہ کے باپ کو اس میں نہ لانا چاہیئے۔"

میں نے اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ قصاب اس معاملہ میں ضرور آئے گا خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے اور یہ کہ وہ تمام زور جو وہ قصاب کی لڑکی سے عشق کرنے اور اسے راہ پر لانے کے لئے استعمال کر رہا ہے، دراصل اسے قصاب سے عشق کرنے اور اس کو راہ پر لانے میں صرف کرنا چاہیئے تھا۔ لڑکی اگر راہ پر آ بھی جائے جو قرین قیاس نہ تھا تو بھی اس کے باپ کی مرضی اور شادی کے معاملہ میں اس کا منشا نہایت ضروری تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ رضیہ ان لڑکیوں میں سے نہیں جو اپنے عاشقوں کے لئے اپنے سرپرست اور والد کے گھر سے بھاگ کھڑی ہو۔ اور پھر قربان علی کٹارا ان ایسے البیلے عاشقوں میں سے بھی نہیں تھا جو کسی لڑکی کو بھگا سکنے کی ہمت رکھتے ہوں۔

میرا خیال ہے میرے دلائل نے اسے کسی قدر متاثر ضرور کیا اور اگر رضیہ کا باپ اس خوف ناک قصاب کی بجائے کوئی اور شخص ہوتا، کوئی بے ضرر نرم طبیعت بوڑھا، تو وہ میری تجویز اور مشورے کی گرمجوشی سے تائید کرتا... مگر قصاب کے تصور سے ہی اس کی جان جاتی تھی۔ قصاب کو جیتنے کی کوشش کرنا اسے ایک خوف ناک مرحلہ لگتا تھا اور اس کے دماغ میں اس کا تصور ایک نوکدار سینگوں والے زبردست مرکھنے بیل کا تھا جو کسی آدمی خصوصاً قربان علی کنار پر چڑھ دوڑنے اور اپنے سینگوں سے اس کا پیٹ چاک کرنے کے لئے کسی بہانے کی تلاش میں ہو۔

اگر کوئی نوجوان جو اس لڑکی کے رجسے وہ اپنا نصف بہتر بنانا چاہتا ہو) باپ کے لئے ایسے ناخوشگوار تجربات رکھے تو اسے چاہئے کہ وہ اس لڑکی کو نصف بہتر بنانے کی اُمید کو طاق پر رکھ دے اور کسی دوسری لڑکی کی چھان بین کرے جس کا سرپرست یا تو کوئی شکور گن مہربان داڑھی والا بوڑھا ہو یا ہو ہی نہ ــــ کنار شاید یہ حقیقت بھی سمجھتا تھا کہ دنیا کا کوئی خسر ارادتاً کبھی کنار کو اپنا داماد بنا لینے پر اکسایا نہیں جا سکتا۔ اس میں کوئی بھی ایسی چیز نہ تھی جو ہونے والے خسروں کو مرعوب ہوتی ہے۔ ایک چیز کنار کے پاس ضرور تھی، اگرچہ اسے اس کا علم نہ تھا۔ اس کے پاس فلیٹ تھا۔ جیسا کہ ہر کسی کو معلوم ہے کوئی شخص جس کے پاس فلیٹ ہو، موجودہ کراچی میں بے حد رشک اور عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور یقیناً سوسائٹی میں عزت اور تکریم کا مستحق ہے۔ کراچی کے کئی خسروں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں جنہوں نے کسی آدمی کو صرف اس لئے لڑکی دے دی کہ اس کے پاس فلیٹ تھا۔ اور جو لڑکی دینے کے بعد اپنے پورے کنبے کے ساتھ اپنے داماد کے فلیٹ میں جا نازل ہوئے.... مادی لحاظ سے بھی ایک نقطہ کنار کے حق میں ایسا تھا جس سے خسر حضرات اُس کی طرف مائل ہو سکتے تھے اور یہ نقطہ قصاب کی صورت میں زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا کیونکہ اس کا پہلے ہی اپنا ایک مکان تھا اور محض فلیٹوں والے داماد اس کے لئے زیادہ

کشش کا باعث نہ تھے۔

یہاں پیارا پڑھنے والا شاید تعجب کرے کہ میں شیخ قربان علی کی کامیابی کے مواقع کا احساس رکھتے ہوئے بھی۔ اپنے آپ کو اس کے اس معاشقہ کے معاملے میں اس حد تک سرگرم کیوں بنا رہا تھا۔ در آنحالیکہ اس کے پہلے اس قسم کے معاشقوں میں میں نے عموماً ایک تماشائی بنے رہنے پر قناعت کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مرتبہ میں محسوس کرتا تھا کہ کنارکا یہ عشق اس بار حقیقی چیز ہے اور یہ کہ اگر اس کا انجام ازدواجی بندھنوں میں ہوا تو اغلب تھا کہ کنار کی زندگی یکسر بدل جائے اور وہ اپنی ناول نویسی کے دَور کا پھر سے آغاز کر دے۔ ایک اور وجہ یہ تھی کہ رضیہ ایک پُرکشش لڑکی تھی اور اس جیسی بھاوج کا ہونا خوش قسمتی کی بات تھی۔ اس کو صرف فرائڈ کے شاگرد ہی سمجھ سکتے ہیں، یعنی اس کا تعلق کچھ میرے تحت الشعور یا لاشعور وغیرہ سے ہے۔ بہرحال پیارے پڑھنے والے کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں اب میدان میں آستینیں چڑھائے ہوئے اُتر چکا تھا اور اپنے دوست کی خاطر آگ اور پانی میں سے گزرنے تک کے لئے تیار تھا۔

شیخ قربان علی کنار سے رخصت لیتے وقت میں تہیہ کر چکا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح قصاب کو دوست بنانے کی کوشش کروں گا۔

جب میں قربان علی کنار کے فلیٹ سے نیچے گلی میں اترا، کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ مڈل وے اسٹریٹ میں بجلی کے کھمبے تو ہیں لیکن میں نے ان کو کبھی روشن ہوتے نہیں دیکھا۔ لیمپوں کے بلب عرصہ سے 'فیوز' ہو چکے ہیں اور اس وقت سے کسی نے انہیں بدل دینے کے متعلق نہیں سوچا۔

سامنے حسن علی کی سوڈا لیمن کی دوکان گلی کی تاریکی میں روشنی کی ایک مستطیل تھی۔ اور اس میں سجے ہوئے مختلف سگرٹوں کے ٹین پر زور دعوت دے رہے تھے۔ میں وہاں سگرٹ لینے گیا۔ دوکان کے سامنے ایک اور شخص کھڑا پان چبا رہا تھا —— ڈھیلے پاجامے اور لمبی قمیص میں ایک بھاری جثّہ والا شخص۔ اس کے بال سر کے درمیان میں ایک گول دائرے سے جھڑ رہے تھے اور اس گنجے حصّے پر دوکان کی پیلی روشنی چمک کر پرکشش نتائج پیدا کر رہی تھی۔ اس آدمی کی شکل بے حد سفاکانہ تھی اور اینٹھی ہوئی ہٹلرانہ مونچھیں اس تاثر کو زیادہ شدید بنا رہی تھیں۔ مگر عجیب طور سے اس کی آنکھیں ایک پرندے کی آنکھوں کی طرح گول اور معصوم تھیں جیسے کسی بچے کی ہوں۔ جبڑا مضبوط تھا اور ایک واضح جارحانہ طریق پر آگے بڑھا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس شخص نے مونچھیں ہٹلر سے چھینی ہوں جبڑا مسولینی سے اور آنکھوں کی بے وقوفانہ ملائم جھلک پریذیڈنٹ ٹرومین سے۔ اس ساری خوفناکی کے ساتھ اس کے چہرے کی رنگت میلی اور آٹے کی سی تھی، وہ بیمار تھا۔ یہ وہی قصاب تھا —— رضیہ کا باپ . . . . اسے دیکھتے ہی میں نے جو وا قفیت گانٹھنے کے

منصوبے باندھے تھے یک لخت چھوڑ دیئے اور سگریٹ سُلگا کر کھسکنے کی سوچی۔ کسی نے جیسے پیچھے سے آواز دی "مسٹر۔ او مسٹر"۔۔۔ میں نے اس "مسٹر" کو نظر انداز کرتے ہوئے مڈل ڈے اسٹریٹ میں اپنے سفر کو جاری رکھا اور تہیہ کر لیا کہ پہلے ہی موڑ پر مڑ جاؤں گا۔

مگر قصاب میرے پیچھے لپکتا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آ پہنچا اور اس ڈر سے کہ کہیں دوسری گردن ہی نہ آن دبوچے، میں نے مڑ کر اس سے فوراً مخاطب ہونے میں دانشمندی سمجھی۔ میں نے چہرہ پر ایک تعجب کی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"آپ نے مجھے آواز دی؟"

"مسٹر! بہرے تو نہیں ہو؟" اس نے کھُردرے پن سے کہا۔ یہ ایک دوستانہ گفتگو کے لئے اچھی پرامید ابتدا نہ تھی۔۔۔

"نہیں۔ میرا خیال تو نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہاں بعض دفعہ خشکی کی وجہ سے میرے کان بہت بند ہو جاتے ہیں۔"

"کیا کہا خشکی کی وجہ سے کان بند ہو جاتے ہیں" وہ چلایا "مجھے خود آج کل یہی تکلیف ہے۔ مجھے اور بھی کئی تکلیفیں ہیں اور یہ ان میں سے ایک ہے۔ مجھے جب کبھی یہ تکلیف ہوتی ہے تو اُن رمالش، والے لڑکوں سے اپنے کان کھُرچوا کر سرسوں کا تیل ڈلوا لیتا ہوں افاقہ ہو جاتا ہے۔ تم کیا علاج کرتے ہو!"

"میں! میں!" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں کچھ نہیں کرتا۔ میرا مطلب ہے اپنے کانوں میں ہوا بھر کر پھیلاتا ہوں۔۔۔ اس طرح (میں نے کر کے دکھایا) اور پھر اپنے کانوں کے رستے اسے آہستہ آہستہ باہر نکال دیتا ہوں۔ میں چاہوں تو کانوں کے ذریعہ سانس لے سکتا ہوں۔"

"کمال ہے! مسٹر! کمال ہے" اس کی پرندے جیسی آنکھیں اس کے سفاک چہرہ پر ٹمٹمانے لگیں۔ "اچھا! میں نے تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔ وہ چھنے اور پھمن والا شخص تمہارا

دوست ہے کیا۔"

"تمہارا مطلب شیخ قربان علی کنار سے ہے"

"جو کچھ بھی وہ ہو کنارا یا پنار! اسے کہہ دو کہ اگر اس نے اپنی اُلّو جیسی آنکھوں سے میرے مکان کی طرف گھور گھور کر دیکھنا بند نہ کیا تو میں اُسے جبّے سمیت ذبح کر کے مارکیٹ میں بکروں کے ساتھ اُلٹا لٹکا دوں گا۔"

"اچھا۔ اچھا میں ابھی جا کر اسے یہ خبر دیتا ہوں" میں نے اسے یقین دلایا۔

"اچھا یہ کوّے کا بچہ کرتا کیا ہے؟"

"تمہارا مطلب شیخ قربان علی کنار سے ہے"

"میرا مطلب اسی قربانی کے بکرے سے ہے"

"وہ — وہ پروفیسر ہے... پروفیسر تم جانتے ہو یہ عینک لگانے والے شخص جو موٹی موٹی کتابیں پڑھتے ہیں اور جب کتابوں سے تھک جاتے ہیں تو نظریں تازہ کرنے کے لئے کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگتے ہیں۔"

"میں اس پروفیسر کی پوستین اُتار کر اس میں بھُس بھروا دوں گا! پروفیسر! نظریں تازہ کرنے کے لئے کیا میرا مکان ہی رہ گیا ہے۔"

"یہ محض اتفاق ہے" میں نے اسے سمجھایا۔ "بات یہ ہے کہ تمہارا مکان اس کے فلیٹ کے بالکل مقابل ہے اور اس کے فلیٹ کی کھڑکی بھی تمہارے مکان کی طرف کھلتی ہے۔"

"یہ اچھی بات نہیں مسٹر" اس نے کہا۔ "ہم غیرت دار شخص ہیں۔ میری بہو بیٹیاں ہیں"

"کتنی" میں بولا۔ اس نے مجھے ضرور سُن لیا ہوگا مگر میرے سوال کو غیر متعلق سمجھ کر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اسے کہہ دو پروفیسری کرنی ہے تو کہیں اور کیا کرے اور اگر میں نے اسے پھر اپنے مکان کی طرف آنکھ اُٹھاتے ہوئے بھی دیکھ لیا — تو — تو بھلا! میں کیا کروں گا..."

میں نے اسے بتایا کہ وہ کیا کرے گا۔

"یہ اُسے کہہ دینا!" اُس نے تاکید کی۔ "اور تم بڑے اچھے سمجھدار دوکے نظر آتے ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا تم نے ایسے کمینے سے راہ و رسم کیوں رکھی ہوئی ہے۔"

"میں پروفیسر کنار سے سبق لینے کے لئے آتا ہوں۔"

" تم ابھی تک طالب علم ہو؟"

"ویسے میں پرائیویٹ طور پر امتحان دے رہا ہوں" میں نے کہا "میں بزنس مین ہوں۔"

"کونسا بزنس۔ خشک میوہ کا؟"

"ڈبل روٹی کا!" میں نے کہا اور پھر اچانک بزنس کو دھیان میں لاتے ہوئے "آپ ڈبل روٹی کہاں سے لیتے ہو۔ ہماری ڈبل روٹی کراچی بھر میں بہترین ہوتی ہے۔ چار آنے میں چھوٹی اور آٹھ آنے میں بڑی۔ ہمارا آدمی خود آکے دے جایا کرے گا.... یہ اللہ توکل بیکری ہے۔ میں۔ یعنی میں خود اس کا ... اور ... میجنگ ڈائرکٹر ہوں۔"

"اچھا یہ اللہ توکل کمپنی جو اڈے کے پیچھے ہے آپ کی ہے۔ میں ادھر سے کئی دفعہ گزرا ہوں۔"

اس نے دفعتاً مجھے "آپ" تک آتے ہوئے کہا۔ وہ اس قسم کے آدمیوں میں سے تھا جو دنیاوی کامیابی کا پورا پورا لحاظ کرتے ہیں اور اس کی ٹمٹماتی ہوئی آنکھیں ظاہر کر رہی تھیں کہ میں اس کی نگاہوں میں اب یک لخت اہم بن گیا ہوں۔

"آئیے! ڈائرکٹر صاحب! پان وغیرہ کھائیے۔" اس کے سفاکانہ رویئے پر اب میرے لئے ایک لحاظ سا تھا ــــ

"پھر کبھی سہی" میں نے جواب دیا "آپ سے مل کر مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے جیسی بہت کم شخصوں سے مل کر ہوتی ہے.... آپ کی شکل میرے باپ سے بہت ملتی ہے۔"

وہ اس پر ہنسا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس نے خوشی سے بغلیں بجائیں۔

"آپ کس بزنس میں ہیں" میں نے پوچھا۔

"میں لی مارکیٹ میں چیف قصاب ہوں۔ ڈائرکٹر صاحب! آپ گوشت کہاں سے خریدتے ہیں۔"

"آئندہ آپ سے لیا کریں گے" میں نے جواب دیا۔ "میرا بیکری کے ساتھ ایک ہوٹل بھی ہے اور ہمیں تقریباً دس سیر گوشت کی روزانہ ضرورت ہوتی ہے۔"

"اچھا ہوٹل بھی ہے۔ جزاک اللہ میں انشاء اللہ عمدہ سے عمدہ، نرم سے نرم گوشت آپ کے لئے رکھ دیا کروں گا اور آپ سے دام بھی مارکیٹ سے کم ہی لیا کروں گا اور اپنے آدمی کو کہہ دیں کہ صبح ایک ڈبل روٹی یہاں دے جایا کرے۔ میں تو آج کل صبح صرف خالی چائے پیتا ہوں، ڈاکٹر کہتے ہیں میرے پیٹ میں سرطان ہے اس لئے نشاستہ سے کلی پرہیز کرتا ہوں۔ میرے سوا گھر میں اور دو آدمی ہیں۔ میری لڑکی اور مالہ لڑکی کی ماں بے چاری مر چکی ہے۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون!" میں نے کہا۔

"نہیں اس بے چاری کو تو مرے بارہ سال ہو چکے ہیں۔ بڑی اچھی عورت تھی بھلی مانس عورت تھی۔ میں اس کو بے تحاشا پیٹا کرتا تھا، اف تک نہ کرتی تھی۔ یہی لڑکی میری ایک ہی اولاد ہے۔ یہیں گرلز کالج میں پڑھتی ہے ایف اے میں۔ اس کا کہیں اچھے برسر روزگار لڑکے سے رشتہ ہو جائے تو میرا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ ڈائرکٹر صاحب! اگر کوئی لڑکا آپ کی نگاہ میں ہو تو مجھے بتایئے گا۔"

"قربان علی کٹار ابھی تک غیر شادی شدہ ہے" میں نے ذرا لبے تکے طریقہ پہ کہا۔

"وہ کون ہے۔ کیسا لڑکا ہے" اس نے پوچھا۔ وہ ابھی سے بھول گیا تھا کہ قربان علی کٹار اس شخص کا نام تھا جس کی پوتیبن وغیرہ کھنچوانے کی تجویز اس کے مدنظر تھی۔

"اچھا ہونہار لڑکا ہے" میں نے کہا۔ "میں اس کو کبھی آپ کے پاس ملانے کے لئے لاؤں گا۔۔۔"

"ضرور۔ ضرور"، اس نے اپنے پیٹ پر اچانک ایک درد کے دورہ کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ہاتھ باندھے "یہ سرطان آج پہلے سے زیادہ تکلیف دے رہا ہے۔ اب چل کر ٹکور وغیرہ کرتا ہوں۔ اچھا خدا حافظ! اب تو انشاءاللہ ملاقات ہوتی ہی رہے گی!"

وہ بے حد تکلیف میں تھا، میلا، بے خون چہرہ اور زیادہ میلا اور بے خون ہو گیا میرا اس کے احتجاج کے باوجود اس کے کندھے کے گرد ہاتھ ڈالنا ایسا ہی تھا جیسے دوستی کے تحت ایک شیر سے بغل گیر ہونا سیڑھیوں پر اس نے میرا ہاتھ گرمجوشی سے ہلایا اور "شکریہ ڈاکٹر صاحب"، کہہ کر ہانپتا ہوا اوپر چڑھ گیا ــــ اب قصاب میرا دوست تھا اور اس حوصلہ شکن آغاز گفتگو کے باوجود معاملہ خود بخود ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کے لئے غالباً مجھے اللہ توکل بیکری کا شکر گزار ہونا چاہیئے تھا کیونکہ قصاب کامیابی کی قدر کرتا تھا ــــ ان سب آدمیوں کی طرح جن کا ظاہر خواہ کتنا ہی ناخوشگوار اور حوصلہ شکن ہو! اور جن کا دل کتنا ہی سخت ہو، جو بن بیاہی بیٹیوں کے باپ ہوتے ہیں اور سرطان یا کوئی دوسرا مہلک عارضہ انہیں کچھ زیادہ مہلت دیتا معلوم نہیں ہوتا۔

رضیہ کے باپ سے میری اس دوستانہ اور مصالحانہ گفتگو کے تین روز بعد میں اور کمار ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لی مارکٹ کے پاس سے گزر رہے تھے۔ لی مارکٹ کا وسطی ٹاور چاکی واڑا کے لئے وہی کچھ ہے جو پیرس کے لئے ایفل ٹاور اور خواہ تم چاکی واڑا کے کسی حصے میں ہو تم اس سے نہیں بچ سکتے۔ یہ ٹاور چاکی واڑا کے لوگوں کی زندگی پر ہر لحظ مسلط رہتا ہے اور وہ ایک قسم کا مرکز ہے جس کے گرد یہاں کے شہری برق پاروں کی طرح طواف کرتے رہتے ہیں، اس ٹاور کے بغیر وہ سب لوگ جیسے کھو جائیں گے اپنے مرکز کے بغیر ان کی زندگیاں بے مقصد اور بے حصول ہو جائیں گی، وہ پرے ہٹ جائیں گے اور شاید یہ ریزے آپس میں ٹکرا اٹھیں گے اور خوفناک نتائج پیدا ہوں۔ یہ ایک تہذیب، ایک عصر کا خاتمہ ہوگا... مایوس، خالی جیب نوجوان یہاں آکر اس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ڈھارس سی پاتے ہیں۔ اور دُنیا کی بے رحمیوں کا سامنا کرنے کے لئے نیا حوصلہ! چاکی واڑا کے شاعر آرٹسٹ اور ناول نگار یہاں اپنی اگلی نظم اور اگلے ناول کے لئے فیضان حاصل کرنے آتے ہیں۔ (وہ اس کے لئے ٹاور کے کلاک کی طرف گھنٹوں گھڑے تکتے ہیں) اور قرض خواہ اپنے مقروضوں کو کہیں اور نہ پاکر، یہاں ان کے دیدار سے مشرف ہوتے ہیں اور اپنے قرضے وصول کرتے ہیں۔ چاکی واڑ نیے اپنی ساری ضروریات کے لئے لی مارکیٹ ہی آتے ہیں اور ٹاور کے نیچے دنیا کا سب سے عجیب اور پُر فریب بازار ہے جہاں بڑی بڑی رنگین سبزیوں اور پھلوں کے ڈھیروں کے درمیان ان کے ویسے ہی بھڑکیلے اور پُر تصویر

گاہک مختلف گوبھیاں، گاجریں اور شلغم وغیرہ گنتے ہوئے سودا کرتے نظر آتے ہیں۔ اس بازار کی کشش صرف دیکھنے ہی سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ ٹاور کے ساتھ ایک چھوٹا روضہ ہے۔ اپنے علموں اور نشانوں کے ساتھ اور بوڑھا آدمی جو اس میں سویا ہوا ہے، کپتان دلی نہیں جس نے جاکی داڑا کو یہ بابل کا برج دیا۔ بلکہ پیر جھمبو ہے جو یہاں کا ساتھا اور بڑا پیر ہے۔ وہ جاکی واڑیوں کو لڈ کے دیتا ہے، ان کے کاروبار میں ترقی دیتا ہے، ان کو مارشوں سے نجات دیتا ہے کئی اور اچھے اور پُر برکت کام کرتا ہے۔ روضہ کے ساتھ ایک چھت والی مارکیٹ ہے جس میں قصابوں کی دکانیں ہیں اور بہت کم سانڈھے اور بکرے جو اس کے اندر داخل ہوتے ہیں باہر سلامت نکلتے ہیں۔ میری اور قربان علی کی گفتگو کا موضوع وہی 'بالکنی کی دلربا حسینہ' بنی ہوئی تھی اور قربان حسب معمول مجھ پر واضح کر رہا تھا کہ کس طرح اس کے ناولوں کے پلاٹوں سے اس عشقیہ گتھی کو حل کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ میں اس کی باتوں کو کچھ سُنی کچھ اَن سُنی کر رہا تھا اور زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہ اپنی سکیموں میں مجھے نقاب پوش کا رول دینے پر مصر تھا۔ میں ایک دوست کے لئے سات سمندر پار کرکے جنوں وغیرہ سے نبرد آزمائی کرنے کو تیار ہوں مگر یہ نقاب پوش کے رول کا معاملہ مجھے ناپسند تھا اور یہ بات میرے دل کو نہ لگتی تھی۔ اس کا مجھ پر بے وفائی اور وقت پر دوست کی مدد نہ کرنے کا الزام بھی مجھے متاثر نہیں کر رہا تھا۔

اچانک میں نے روضہ میں سے عامل کامل شاہسوار خان کو معہ اپنے دو ساتھیوں یعنی معتوب جنوں کے برآمد ہوتے دیکھا۔۔۔۔ اس نئی ناگزیر آفت کو دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہوگئے، میں نے قدرتی طور پر ایک غوطہ سا لگایا اور حیران و پریشان کٹار کو کھینچتا ہوا جسے معلوم نہ تھا کہ معاملہ کیا ہے مجمع میں سے ہوتا ہوا قصابوں کی مارکیٹ کے اندر جاکر پناہ گزین ہوا۔ یہاں میں نے کچھ اطمینان کا سانس لیا۔

"کیا بات ہے؟" قربان علی کٹار نے کہا "دودھ والا تو نہیں تھا؟" کیونکہ وہ خود کئی بار

اس دودھ والے سے اس طرح بھاگ کر چھپا تھا اور اس کے نزدیک ایسی پشیمانی میں آدمی فقط اس دودھ والے سے ہی بھاگ سکتا تھا۔

"شاہسوار خاں تھا" میں نے اسے بتایا۔

"شاہسوار خاں ــــ تمہارا مطلب ہے پروفیسر شاہسوار خاں؟"

"وہی"

"اس سے بھاگنے کی کیا وجہ ہے؟" کنار نے کہا "وہ تو ایک بے حد کارآمد اور مرنجان مرنج شخص ہے۔ میں تو دو ہفتے سے اس کی تلاش میں ہوں۔ اس نے مجھے ایک عمل کا وعدہ کیا تھا اور میں نے اسے ہدیہ بھی پیشگی دے دیا تھا ــــ دو روپیہ آٹھ آنہ۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے مجھے باہر کھینچتے ہوئے کہا۔

اچانک مجھے ایک روشن خیال آیا۔ رضیہ کا باپ اسی مارکیٹ میں ہوگا! اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں قربان علی کنار کو اس سے ملنے کے لئے لاؤں گا۔ یہ ایک سنہری موقع تھا۔ سامنے سٹالوں پر بیٹھے ہوئے قصابوں پر نظر مارتے ہوئے مجھے کہیں نظر نہ پڑا مگر ہم پرے کونے پر راستہ کی طرف بڑھ گئے وہ اپنے سٹال کے نیچے کھڑا ہوا ایک چھرے سے ایک بکرے کی ران کا قیمہ بنانے میں مشغول تھا۔ اس نے ایک بنیان پہن رکھی تھی۔ اس کے سیاہ بازو کی سیاہ مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں اور اپنے دیوہیکل جسم اور سفاکانہ چہرے کے ساتھ وہ کافی خونخوار لگ رہا تھا۔

"وہ دیکھو! کنار!" میں نے کہا "وہ ہے تمہارا ہونے والا خسر"

ایک لحظہ کے لئے کنار کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جب آیا تو اس نے دروازہ کی طرف بھاگنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے روک لیا۔

"بات سنو!" میں نے کہا "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ نہیں، کہ نہیں کہ رضیہ کا باپ تم سے ملنا چاہتا ہے، وہ خود ایک داماد کی سخت تلاش میں ہے۔ میں نے اس کے سامنے تمہاری

تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں اس سے کہا ہے کہ تم پروفیسر ہو اور لائق فائق شخص ہو۔ وہ میری باتوں سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ اپنی لڑکی کسی کو دے گا تو قربان علی کٹار کو ورنہ گھر بٹھلائے رکھے گا۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر تم خود اس سے جا کر یہ کہو کہ تم اس کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو اسے بے حد خوشی ہو گی اور اس کی دیرینہ آرزو بر آئے گی۔"

"پھر کسی وقت اس سے مل لوں گا،" قربان علی کٹار نے فرار کے لئے رستہ تاڑتے ہوئے کہا۔

"بنے بنائے کام کو مت بگاڑو کٹار!" میں نے کہا "ایک لمحے کے لئے اتنے دلیر بن جاؤ جتنا تمہارے ناولوں کا کوئی ہیرو..... یہ شخص سونے کے دل کا مالک ہے اس نے تمہیں دیکھا ہوا ہے اور اس سے کہو کہ تم اس کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو...... شاباش! ہمت کرو۔"

"وہ اس وقت مصروف ہے،" کٹار نے کہا "وہ قیمہ بنا رہا ہے۔" (شیخ قربان علی کٹار لوگوں کی مصروفیتوں میں مخل ہونا پسند نہیں کرتا)۔

"قیمہ بناتے وقت اس کا موڈ بہترین اور خوشگوار ترین ہوتا ہے۔"

مجھے اس کی کافی منتیں کرنا پڑیں، اس کی مردانگی پر طعنہ زنی کرنا پڑی ...... اور آخر قربان علی کٹار نے اپنا جی کڑا کیا اور یہ اس کی زندگی کا دلیرانہ ترین فعل تھا اور اس کے لئے میں ہی ذمہ دار تھا۔ میں اس کے ساتھ مکرانی قصاب کے سٹال سے پانچ قدم کے فاصلے تک آیا جس کے بعد وہ اکیلا آگے ایک خود احساس مبالغہ آمیز حوصلے سے بڑھا ایک بزدل کے حوصلے سے۔ وہ قصاب کی پیٹھ پیچھے جا کھڑا ہوا اور اس کے تن و توش کے مقابلے میں وہ شخص ایک چوزہ سا لگ رہا تھا..... قصاب اس کی موجودگی سے بے خبر کام اپنے کام میں مشغول تھا...... کٹار نے میری طرف دیکھا۔ میں نے منہ کے اشارے سے اس کی

ہمت بڑھائی اور اس نے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے گاؤن کو تھامتے ہوئے ایک نہایت کمزور آواز میں کہا۔

" سردار قصاب صاحب۔ میں ہوں قربان علی کٹار۔ پروفیسر قربان علی کٹار۔"

" ہوں! ہوں!" قصاب کے منہ سے اطمینان کی غراہٹیں آئیں مگر اپنے ملاقاتی کی اطلاع پر نہیں جسے غالباً اس نے سنا: تھا بلکہ ایک سخت جوڑ سے کامیابی سے نبٹنے سے۔

" کیا آپ مجھ کو اپنی فرزندی میں لینا قبول کریں گے ۔" قربان علی کٹار نے ڈرتے ڈرتے ذرا اونچا کہا۔

" کیا؟" قصاب اپنے چھرے کو ہوا میں تولے پلٹ کر مڑا۔

" ایک سیر گوشت چاہیئے" کٹار نے کہا " ران کا ہو۔"!

" گوشت میرے پاس نہیں ہے۔ بھاگ جاؤ۔ پھر میری دوکان پر یا کہ مارکیٹ میں تمہاری شکل نظر آئی تو تمہیں اُٹھا کر اس لکڑی پہ رکھ کر تمہارا قیمہ بنا دوں گا۔ کیا تم کو تمہارے دوست نے میرے ارادوں کے متعلق نہیں بتایا۔"

" شاید آپ کو غلطی ہوئی ہے،" کٹار نے کہا " میں قربان علی کٹار ہوں ——— پروفیسر قربان علی کٹار۔"

" ڈاکٹر کٹار صاحب،" قصاب نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اس کا طرزِ عمل دھیما اور زیادہ مذبانہ ہو گیا " کیا آپ کے گھر ماں بہنیں نہیں ہیں۔"

" نہیں،" کٹار نے معصومیت سے کہا " ماں انتقال کر چکی ہے۔ بہنیں ہے ہی نہیں، میں اکیلا ہوں۔ تمہاری لڑکی کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

" دوڑو یہاں سے،" قصاب پھر غصے سے گرجا اور ہر ایک شخص مارکیٹ کے شور کے باوجود ادھر دیکھنے لگا " پروفیسری نکال دوں گا ——— کوا کہیں کا!"

میں قربان علی کٹار کو وہاں سے اپنے ساتھ باہر لے آیا۔ ایک دفعہ لی مارکیٹ کے

اگر اس نے مجھے اس بے عزتی کا ذمہ دار گردانا اگرچہ میں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے کوآکما گیا ہے؟" اس نے ایک دکھے ہوئے لہجہ میں کہا — "میں نے تمہیں بتایا ہے کہ لڑکیوں کے والد مجھے موافق نہیں آتے اور تم نے زبردستی مجھے اس کے سر پہ مڑھا۔ فرض کیا وہ مجھے چھرے سے ہلاک کر دیتا تو پھر — تم کیا کرتے،"

"اس کا یہ ارادہ نہ تھا،" میں نے کہا "یہ اس کا عام بولنے کا طریقہ ہے۔ اس کا دل، میں تم کو یقین دلاتا ہوں، سونے کا ہے۔"

"یہ شخص غیر شائستہ ہے۔ درندہ ہے،" کنار بولا۔

اس واقعہ کے بعد کنار کو مجھ سے خواہ مخواہ ایک رنجش پیدا ہو گئی۔ اس نے مجھے الزام دیا کہ یہ جانتے ہوئے کہ قصاب کا انداز اس کی طرف معاندانہ اور بداندیشانہ ہے میں نے اسے اس سے بیٹی مانگنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس طرح اس کی زندگی کو سخت خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں جان بوجھ کر اس کو گوشت مارکیٹ میں لایا تھا اور یہ کہ قصاب نے کبھی اس سے ملنے کی خواہش نہ کی تھی بلکہ میں نے یہ سب کچھ خود گھڑا تھا۔

"اور اگر اس نے کی تھی،" کنار نے کہا "تو مجھے یقین ہے اس نے کی تھی تاکہ وہ میرے خون سے اپنے ہاتھ ناپاک کر سکے میرے لئے سب سے تعجب کی بات یہ ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں اور چل پھر رہا ہوں۔"

میں نے یہ مانتے ہوئے کہ قصاب کا انداز کچھ زیادہ دوستانہ نہ تھا اس بات سے انکار کیا کہ اسے قصاب سے ملنے کے لئے کہنے میں میرا ارادہ کینہ ورانہ تھا۔ انٹرویو، شاید غلط فہمی کی وجہ سے زیادہ بارآور نہیں ہوا مگر اس سے میرے خلوص پر حرف نہ آنا چاہئیے۔

"ممکن ہے،" میں نے کہا "قصاب نے محض یہ انداز اپنے ہونے والے داماد کی جرأت اور خود اعتمادی کی آزمائش کرنے کے لئے اختیار کیا ہو۔"

"اور تمہاری طرف اس کا طور کچھ ادب کا تھا" کمار نے شک و شبہ سے کہا "اس نے تم کو ڈائرکٹر صاحب کہا۔ شاید تم نے اس کو بتایا ہے کہ تم فلم ڈائریکٹر ہو۔"

"میں نے اسے کہا ہے کہ میں اللہ توکل کا ڈائرکٹر ہوں۔"

"ڈائرکٹر صاحب! ڈائرکٹر صاحب!" وہ راستے میں رُک کر سر سے پاؤں تک کانپتا ہوا طیش میں بولا "چنگیزی کے بچے! میں تمہاری اس ساری چالاکی کو بھانپ گیا ہوں۔ تم اس قصاب پر اپنی دھونس جما کر اسے گانٹھ رہے ہو۔۔۔ تم رضیہ سے خود شادی کرنا چاہتے ہو اس کا تو مجھے دو تین دن سے شک ہے۔ اسی وقت سے جب میں نے تم کو نقاب پوش بننے کے لئے درخواست کی تھی اور تم نے ٹال مٹول کر دی تھی ـــ اندریں حالات! یہ بہتر ہے کہ ہماری دوستی ختم ہو جائے اور ہم زندگی میں اپنے الگ الگ راستوں پر ہو جائیں۔"

"ـــ اور تمہارے کھانے اور قمیصوں کا مسئلہ۔ اس دوستی کے انقطاع سے تم گھاٹے میں رہو گے۔" میں نے بھی ذرا گرم ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے ظاہر کیا جیسے اس نے میری اس بات کو نہیں سنا۔

"آج سے ہم دوست نہیں ہیں" اس نے لی مارکیٹ کے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آج نومبر ۱۰ ، گیارہ بج کر پچیس منٹ ایک تاریخی دوستی ایک شخص کی بے وفائی اور عدم خلوص کی وجہ سے ختم ہوتی ہے۔ آج قربان علی کمار اور اقبال حسین چنگیزی اپنے مختلف راستوں پر ہوتے ہیں۔" اس نے سامنے ایک ایرانی راسٹوران کو دیکھتے ہوئے کہا "ہم ایک آخری چائے کا پیالہ اکٹھے اس پرحسرت لمحے کی یاد میں پئیں گے اور اس کے بعد کمار راسٹوران کے ایک دروازہ میں سے باہر چلا جائے گا اور چنگیزی دوسرے دروازے سے اور وہ پھر کبھی نہ ملیں گے۔"

"اور پیسے کون دے گا۔" میں نے پوچھا "تمہیں معلوم ہے دروازہ پر کاؤنٹر کے اوپر ایک ایسے نین و نقش کا ایرانی بیٹھا ہوتا ہے اور جب ہم میں سے کوئی بھی اُٹھ کر دروازہ کی طرف بڑھے

گا۔ پیچھے سے ایک آواز اس کا تعاقب کرے گی۔ ساڑھے چار آنے۔ سرخ ٹائی۔ ساڑھے چار آنے۔۔۔!

"تمہارا مطلب ہے تمہارے پاس ساڑھے چار آنے بھی نہیں،" اس نے کہا "چنگیزی! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اب بہت کنجوس اور کچھ چھوٹے ہوتے جا رہے ہو۔ میں تم کو ہمیشہ ایسا آدمی سمجھتا تھا جس کا دل اور جیب ہمیشہ اپنے احباب کے لئے کھلے رہتے ہیں" "آؤ پھر بیکری میں چلیں۔ اس لمحہ کی اہمیت ایسی ہے کہ اس کو منانا ضروری ہے۔ میرے دماغ میں ایک نظم تشکیل پا رہی ہے جس کا عنوان ہے "آخری بار چائے پیتے ہوئے۔""

بیکری کی طرف جاتے ہوئے کٹار نے مجھ سے کہا کہ کیونکہ اب ہماری دوستی ختم ہو چکی ہے اس لئے مجھے اپنی آٹوگراف کتاب میں وہ صفحہ جس پر اس نے آٹوگراف لکھا ہے پھاڑ دینا ہوگا اور ہوٹل کی دیوار پر سے اس کا فوٹو اتروا کے اسے دے دینا ہوگا۔۔۔۔ یہ سوچ کر کہ اب کٹار کا فوٹو سامنے کی دیوار پر ابس۔ ایم جلال اور نرگس بغدادی کے فوٹوں کے درمیان سے نیچے کھانے کی میزوں پر نہ دیکھے گا، میری آنکھوں میں آنسو سے آنے لگے۔ مگر میں جانتا تھا کہ جب تک مجھے مصنفوں کو جمع کرنے کا شوق ہے اور قربان علی کٹار کو قمیضیں اُدھار مانگنے کی ضرورت یہ تاریخی دوستی بھی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کے بعد میں قربان علی کنارے چار پانچ دن تک نہ مل سکا . . . دوسرے روز مجھے ایک ضروری کام سے حیدر آباد جانا پڑا ۔ ہوشیار تاج علی مجھے پچھلے مہینے سے یہ اصرار کر رہا تھا کہ اللہ توکل کمپنی کا ایک برانچ آفس حیدر آباد میں کھولا جائے جہاں اس کا ایک بھتیجا ایک چھوٹی دکان الاٹ کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا ۔ میں نے حیدر آباد جا کر اس معاملہ میں ضروری قدم اٹھانے ۔ تاج علی کے بھتیجے سے ملا جیسے بیکریوں کا تجربہ تھا اور چاکی واڑا کی بیکری کے نمونے پر وہاں بھی ایک مشترکہ بیکری اور ہوٹل کا افتتاح کیا ۔ اس کے بعد کامیابی کا سہرا باندھ کر اور اپنے آپ کو واقعی ایک منیجنگ ڈائرکٹر محسوس کرتا ہوا اب ہماری ایک شاخ بھی تھی ، میں واپس کراچی میں لوٹا ۔ آکر تاج علی کو حیدر آباد کی بیکری کی شاخ کے خیریت سے کھل جانے کی خوشخبری دی ۔ ہم آگے بڑھ رہے تھے ـــــ

شام کو میں قربان علی کنارکی فلیٹ پر مڈل وے اسٹریٹ میں گیا ۔ وہ فلیٹ پر نہیں تھا جو اس جیسے شخص کے لئے خلاف معمول تھا ۔ میں وہاں سے واپس اُلٹا پھرا اور کارپوریشن اسٹریٹ پر پہنچ کر بیکری اور لی مارکیٹ کی طرف جانے کی بجائے دائیں طرف "انناس کا شربت بیچنے والوں کے چوک کو ہو لیا میں اس چوک کو اس نام سے پکارتا ہوں ' ورنہ اس کا اصل نام کچھ اور ہے ۔ چاکی واڑا کا سب سے زیادہ بے تکان انناس کا شربت بیچنے والا ـــــ شاید دنیا کا سب سے زیادہ بے تکان انناس کا شربت بیچنے والا اس چوک میں اپنا مفرح شربت بیچتا ہے ۔

"پی لو یارو! ایک آنے گلاس ہے"

"اور ایک آنے گلاس ہے"

"او پی لو یارو"۔۔۔۔۔

ایک بڑی اونچی، کچھ شکایت آمیز، دیوانہ کر دینے والی آواز میں وہ یہ ہانک لگاتا ہے اس کی آواز ایک لمحہ کے لئے خاموش نہیں ہوتی صبح سے شام تک وہ اسی طرح اس تنگ کرنے والی آواز میں چلاتا ہے۔ اگر اس کے شربت میں کچھ فرحت ہے (میں نے اسے کبھی نہیں پیا) تو یہ کرخت، اعصاب کے لئے تباہ کن آواز اس میں سے وہ ساری فرحت اور مٹھاس لے لیتی ہے۔ پہلے پہل اس کے اس چوک میں رقیب بھی تھے۔ دوسرے اناس کے شربت بیچنے والے مگر وہ ملائم آواز، متحمل شخص تھے اور ان کے حلق اتنے مضبوط نہ تھے۔ اس نے ان سب کو ان سے کہیں اونچی اور متواتر چلا چلا کر ہرا دیا اور وہ اس کی اس شدید آواز کی تاب نہ لاکر وہاں سے چلے گئے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنی مدد کے لئے اپنے لڑکوں کی پلٹن بھی لے آیا اور وہ آدھ درجن چھوکرے جو سب سے چھوٹے سے لے کر سب سے بڑے تک اپنے فقید المثال قابل باپ کے ہوبہو، ننھے تھے، اپنے باپ کی راہ نمائی میں اس اونچا چلا کر ہرا دینے والے کھیل میں آ شریک ہوئے۔ ان کا باپ چلاتا "پی لو یارو ایک آنے گلاس ہے" اور اس کے بعد باپ اور بیٹے مل کر کورس میں اپنے حلق کے پورے زور سے چلاتے "پی لو یارو ایک آنے گلاس ہے۔" رقیب اتنے زبردست محاذ کے مقابلے میں بے بس تھے اور وہ تاب نہ لاکر رخصت ہو گئے۔ یہ شخص اب اس چوک میں اکیلا ہے ۔۔ ایک فاتح نپولین جس نے اپنے دشمنوں کو مار بھگایا ہے۔ مگر اس فتح کے باوجود اس کے انداز میں آسودہ خاطری نہیں آئی، اپنے رقیبوں کے واپس لوٹ آنے کے امکان اور خطرہ کے پیش نظر وہ اپنی آواز کو اتنا ہی اونچا اور کرخت رکھے ہوئے ہے اور اس نے اس کو ایک ذرہ بھر نیچا نہیں کیا۔ اس کی پلٹن اس کی مدد کے لئے اسی طرح بدستور موجود ہے اور ان کے لئے غالبًا

بڑے عرصے سے اس رٹ میں اب کوئی لطف نہیں رہا اور ان کے لئے یہ ایک افسردہ لَے
بن کر رہ گئی ہے اور اگر ان میں سے کوئی اپنی پوری آواز سے نہ چیخنے یا اس چیخنے میں بیدل ہو
تو ان کا باپ ایک تند گالی سے اس کو جھڑکتا ہے اور ایک دو ہنٹر بھی رسید کرتا ہے۔ وہ ایک
ظالم باپ ہے۔ اس طرح یہ انتھک باپ بیٹوں کی ٹیم صبح سے رات تک چاکی واڑیوں کے کانوں
میں ایک آنے گلاس ہے، گلاس ہے کا اداس راگ ٹھونکتی رہتی ہے اس شخص کے کردار میں بہت کچھ ہے
جو ہنسنے کے لائق ہے، بہت کچھ ہے جو افسوسناک ہے مگر کچھ ایسا بھی ہے جو قابل تعریف
ہے، اپنے حلق کے نسوں کے بل پر اور اپنے ایک ہی جنون کی بدولت — اپنا اناس بیچنے
کا جنون — اس نے اپنے رقیبوں کو پچھاڑ دیا ہے۔ اس کی فتح حلق کی فتح ہے ۔۔۔ اور ایک
جدید جمہوری سیاست دان کی فتح بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں —

اس چوک سے آگے ایک چھوٹا سا گارڈن ہے۔ ایک آہنی مستطیل جنگلے کے اندر خشک
گھاس کا قطعہ جس پر چند سوکھے ہوئے مصیبت زدہ شہتوت کے درخت اُگے ہوئے ہیں
یہ چاکی واڑا کا ہائیڈ پارک ہے اور ہر شام چاکی واڑا کے ہاں کے ہاں دوائیوں کے موجد اور دوسرے
پبلک کے خیر حضرات یہاں چاکی واڑیوں کو اپنی تازہ ترین تیر بہدف عملوں اور خوراکوں،
اپنی معرکتہ الآرا ایجادوں کے بارے میں اطلاع دینے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اس سے
انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے بعض حضرات فی الواقع کئی لیڈروں سے بہتر اپنے سننے
والوں کے لئے سامان تفریح مہیا کرتے ہیں اور خواہ تم ان کی عجیب دوائیں خریدو یا نہ
خریدو مجمع میں کھڑے ہو کر ان کو سننا ہی سامع کے لئے انسانی نفسیات کا ایک پرانہ
معلومات سبق ہے ۔۔۔۔ میں اکثر شام کو دل لگی اور تفریح کے لئے اس گارڈن میں آ نکلتا
ہوں اور یہاں میں نے اپنی زندگی کی دلآویز ترین تقریریں سنی ہیں جن میں اس کے باوجود
کہ مقرر اپنے پیشے کے پرانے گر اور طریقے استعمال کرتا ہے (مثلاً کہ دانہ خاک میں مل کر
گل گلزار ہوتا ہے) جو اب بہت زیادہ گوش آشنا ہو چکے ہیں، مزاح اور خطابت کی دلچسپی

بعض دفعہ اس قدر ہوتی ہے کہ آدمی خواہ دوائی یا ایجاد کی تاثیر کے بارے میں شک میں ہی رہے تفریح ضرور ہو جاتی ہے۔ یہاں یاد رکھنا چاہیئے کہ عاملوں اور ڈاکٹروں کا تقریر کا آرٹ، دوسری پبلک اسپیکنگ کے آرٹ سے مختلف نوعیت کا ہے اور کوئی آسان فن نہیں، یہ چرب زبانی سے دن دہاڑے لوگوں کو لوٹنے کا فن ہے جو سہل نہیں اور اس میں طاق ہونے کے لئے پہلے اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ ایک ایسا انسان ہو جو اپنے سامعین کو مسحور کر سکے۔ ان عاملوں کی ایک بڑی برادری ہے۔ جب وہ گرم الفاظ میں اپنے مجمع کے سامنے اپنے، ہم پیشہ نقالوں اور اشتہار بازوں کو گالیاں دیتے ہیں اور اپنے آپ کو ان سے الگ بتاتے ہیں تو ان پر یقین کرنے کی ضرورت نہیں۔ تقریر کے بعد وہ اسی ہم پیشہ نقال کے ساتھ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جا کر ہم نوالہ ہوتے ہیں اور دن کے کاروبار کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ شاید ان کا کوئی کالج ہے —— کوئی جامعہ جس سے باقاعدہ سندیں دی جاتی ہیں۔ ورنہ ان میں سے ہر ایک کیوں انہی پرانے مسلمہ اور مقررہ گروں کو جو پرانے اُستاد قائم کر گئے ہیں اپنے سننے والوں کو متوجہ کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ہر ایک عامل ضرور "کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے" والا شعر استعمال کرتا ہے اور یہ یقین رکھو کہ اگر کوئی عامل یہ شعر اپنی تقریر میں استعمال نہیں کرتا تو اس کی اصلیت قابل شبہ ہے اور اس کے پاس برادری کے جامعہ کی کوئی مستند سند نہیں ہے۔ ایسے عامل سے ہمیشہ بچ کے رہو۔

اس وقت ایک سیدھی مونچھوں اور بکرہ ڈاڑھی والا شخص ایک بکس کے اوپر کھڑا ہوا ایک مجمع سے مخاطب ہو رہا تھا۔ بظاہر وہ کسی کالج کا پروفیسر تھا کیونکہ وہ ایک چوکور مستطیل پھندنے والی ٹوپی اور ایک گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ مجھ پر یہ حقیقت تھوڑی دیر بعد کھلی کہ ٹوپی اور کپڑے میرے ہی تھے جو میں نے شیخ کمار کو اُدھار دیئے تھے۔ گاؤن کی بائیں بغل میں ایک چھوٹا سا پیوند تھا جس کو میں نے پہچان لیا . . . مگر گاؤن میں ملبوس شخص یقیناً شیخ قربان علی کمار نہ تھا۔ وہ کافی بڑا اور چوڑا نظر آتا تھا اور اس کی آواز اور چہرہ میں کچھ کچھ چیز ایسی نظر آتی تھی جو جانی

پہچانی معلوم ہوتی تھی۔۔۔ مجھے پہلے تو کٹار پر سخت غصہ آیا۔ اس نے یقیناً یہ میرا گاؤن مجھے لوٹانے کی بجائے اس شخص کو بیچ دیا تھا۔ میں چلانے لگا کہ اس شخص نے میرا گاؤن پہن رکھا ہے، لیکن پھر سوچ کر کر الٹا میں خود اس مجمع میں تماشہ بنوں گا میں خون کے گھونٹ پی کر چپکا ہو گیا۔
بکرہ داڑھی والا شخص اس وقت ایک مسحور مجمع کو ایک طلسمی انگوٹھی کے متعلق بتا رہا تھا۔ جسے اس نے اپنی انگلیوں کے درمیان لوگوں کی نظروں کے سامنے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے دعوے کے بموجب یہ انگوٹھی دراصل اس کے اپنے مرحوم و مغفور دادا کی ایجاد تھی۔ اس کے دادا کے پاس جنات میں سے بعض درس لینے آیا کرتے تھے اور ان میں سے ایک نسکہ گزار جن نے کہ اعلیٰ حسب و نسب اس کا تھا اور نور احمد اس کا نام تھا۔ تحصیل علم کے بعد واپس اپنے ملک جنات میں جانے سے پیشتر یہ عجیب و غریب انگوٹھی اس کے دادا کو دی تھی اور اسے اس کی کرامات سے آگاہ کیا تھا۔۔۔ چنانچہ اس انگوٹھی کے فیض سے بکرہ داڑھی کے دادا نے اپنے موضع میں دو پکے مکان چھتواتے، اپنے شریکوں سے ایک زمین کا مقدمہ جیتا اور بڑھاپے کی عمر میں مرنے سے چار سال پہلے ایک اور نکاح پڑھوایا جس سے اولاد بھی ہوئی یعنی بکرہ داڑھی کا اپنا والد۔ یہ انگوٹھی بکرہ داڑھی کے والد ماجد نے اپنے مرگ سے پہلے اپنی شہادت کی انگلی سے اُتار کر عنایت کی تھی اور وصیت فرمائی تھی کہ بیٹا اس سے خود بھی فیضیاب ہو اور عالم کو بھی فیضیاب کر اور لوگوں کی دعائیں لے۔ بکرہ داڑھی نے بعد میں سوچا کہ والد ماجد کی بات میں کوئی گہرے معنی پنہاں تھے، آخر ایک انگوٹھی سے سارے عالم کی فیضیابی کیوں کر ممکن ہے۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ انگوٹھی میں بذات خود کوئی بات نہیں بلکہ اصل کرامات ان حروف کی ہے جو نگینہ کے نیچے ایک چھوٹے سے کاغذ کے پرزے پر نوشتہ ہیں اور جن کو باریک سے باریک ترین نگاہِ انسانی بھی پڑھنے سے عاجز ہے۔ اس نے تحقیق و شوق سے اس پرزہ کاغذ کو نکالا اور اس کی عبارت کو ایک خوردبین کے نیچے رکھ کر پڑھا۔ یہ جناتی زبان میں لکھے ہوئے ایک عمل کے حروف تھے۔ اس نے کئی دن ان کو لکھنے

کی مشق بہم پہنچائی، پہلے بڑے بڑے حروف ہیں ـــــ اور پھر باریک حروف ہیں اور جب اس کو یہ مشق ہو گئی اس نے اپنے والد مرحوم کی وصیت کے مطابق اس سلیمانی انگوٹھی سے اہل حاجت اور ضرورت مند اصحاب کو فیضیاب کرنے کا سوچا۔ اس کے پاس اب کئی ایسی انگوٹھیاں تھیں جن کے نگینے کے نیچے وہی اصلی انگوٹھی والا تعویذ اس کا خود نوشتہ بند تھا۔ ہر انگوٹھی کی تاثیر میں اور اصل انگوٹھی میں سرمو بھی فرق نہیں۔ تھوڑی سی پریکٹس کے بعد ایک بالغ شخص اس قابل ہو سکتا ہے کہ انگوٹھی کے جن کو اپنے تابع کر سکے اور خود شاہ جنات حضرت سلیمان پیغمبر کی بارگاہ میں رسائی پا کر اپنی مشکل کشائی کر سکے۔ اگر حاضرین میں سے کسی کو مقدمے میں کامیابی نہ ہوتی ہو، کسی کا معشوق اس سے روٹھا ہوا ہے نا قدر بیوی کو طلاق نہ دیتا ہو اور بیوی طلاق چاہتی ہو، سر میں درد رہتا ہو تو اس انگوٹھی کی کرامات سے اور سلیمان پیغمبر کے حکم سے سب مشکلیں دور ہو جائیں گی اور ہر نامراد اپنی مراد کو پہنچے گا۔ . . . بکرے داڑھی نے بتایا کہ اگرچہ بالغ کے لئے دس دن مشق کی ضرورت ہے پیشتر اس کے کہ وہ اس پر عمل کر سکے کوئی بھی چھوٹا معصوم بچہ جس کی عمر دس سال سے کم ہو ہر وقت اس پر عمل کر سکتا ہے اور شاہ جنات سے اپنی مراد پا سکتا ہے اور اب وہ ان کی آنکھوں کے سامنے طلسمی انگوٹھی کی کرامات دکھائے گا۔

"کوئی بھی چھوٹا بچہ آ جائے ـــ آؤ بچے!"

ایک چھوٹا سا بچہ قدرے سہما ہوا آگے بڑھا۔ بکرے داڑھی نے اس سے نام پوچھا، پھر اس سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا اور انگوٹھی کو اپنی انگلی سے اُتار کر لڑکے کی انگلی میں پہنا دیا۔

"بچے! اس انگوٹھی کے نگینے کے شیشے کے اندر ٹکٹکی باندھ کر دیکھو" اس نے بچے کو انگوٹھی کے نیچے پکڑنے کا طریقہ بڑے اہتمام سے سمجھایا جیسے یہ بے حد ضروری ہو۔

"ہاں لڑکے! تمہارا نام!" ـــــ اس نے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

"عبدالشکور،" لڑکے نے سہمے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی عبدالشکور! نگینے میں سے کچھ نظر آتا ہے۔ غور سے دیکھو۔"

"کچھ نہیں!" عبدالشکور نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا جیسے کہ وہ ان توقعات کو پورا نہ کر رہا ہو جو بکر داڑھی کو اس سے تھیں۔

"کچھ نہیں! عبدالشکور۔ تم اپنے باپ کے بیٹے ہو۔"

عبدالشکور نے اس کا جواب دینا ضروری نہ خیال کیا۔ سامعین میں سے بعض اس کو مذاق سمجھ کر ہنسے مگر بکر داڑھی نے ان کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر مجمع کو سنجیدگی سے اعلان کیا کہ کوئی اولاد جو حرام کی ہو اس انگوٹھی کا فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔

"ہاں! عبدالشکور۔" بکر داڑھی نے کہا "غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھو کچھ نظر آتا ہے — گھاس کا لمبا میدان۔"

"ہاں آتا ہے،" لڑکے نے فوراً سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اب اپنے آپ سے بے حد خوش تھا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا۔ مجھے خود بچپن میں ایک عامل نے انگوٹھی میں سے کئی ایسی چیزیں دکھلائی تھیں جو میں نے قطعاً نہ دیکھی تھیں۔

"اور کیا ہے۔ گھاس کے پرے سرے پر ایک سنہری تخت نظر آتا ہے۔"

"آتا ہے۔" بچے کا کام اب بے حد آسان تھا۔

"گھاس کے میدان میں ایک شخص ڈیڑھ انچ کا جس کے سر پہ دو سینگ ہیں اور جس کی پیٹھ تمہاری طرف ہے۔ نظر آتا ہے۔"

"آتا ہے!"

"یہ غفور جن ہے! اس کو حکم دو کہ سنتے کو بلوا کر جھٹکا کرائے۔"

"عبدالغفور! سنتے کو بلوا کر جھٹکا کرا دو۔"

"چلا گیا۔"

"چلا گیا۔"

"سنتا آگیا ہے۔"

"آگیا ہے۔"

"اس نے جھرڑ کا ؤ کر دیا ہے۔"

"کر رہا ہے۔ اب ادھر میری طرف کرتا ہوا آرہا ہے۔۔۔ اب چلا گیا۔"

اسی طرح فغفورچین کے ذریعہ فراش کو بلوایا گیا جس نے ایک سرخ فرش گھاس کے میدان میں بچھا دیا۔ اس کے جانے کے بعد چار جن گھاس کے میدان کے پیچھے سے رُوپہلی تخت کندھوں پر اُٹھا کر لائے اور اسے فرش کے ایک کونے پر رکھ دیا۔ لڑکا اب دلیر ہو گیا تھا اور نہ صرف یہ کہ داڑھی کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا بلکہ اسے خوش کرنے کے لئے اپنی طرف سے کئی چیزیں بڑھا دیتا تھا۔۔۔ پھر نقیبوں نے آواز لگائی "حضرت سلیمان شاہ جناّت اور حضرت مشکل کشا کی سواری آتی ہے" جس کے بعد سلیمان بادشاہ تاج پہلے دربار میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھ گیا ——— لڑکے نے یہ سب کچھ دیکھا!

"اس سلیمان مشکل کشا کو سلام کرو۔ عبدالشکور"

"سلیمان بادشاہ بسلام" لڑکے نے ہاتھ ملتے پرے جاتے ہوئے کہا۔

"سلام کا جواب دیا"

"دیا" لڑکے نے کہا۔

"عبدالشکور! جنوں کے بادشاہ سے عرض کرو کہ اے بادشاہ! میری ایک خواہش ہے اس کو پورا فرمایا جائے۔" عبدالشکور نے انہی الفاظ کو دہرایا۔

"ہاں تو جنوں کے بادشاہ نے کچھ کہا"

"انہوں نے کہا ہے پوری ہو جائے گی" عبدالشکور اب دیکھنے کے ساتھ سننے بھی لگ گیا تھا۔

"عبدالشکور! ان سے عرض کرو کہ حضور بادشاہ سلامت میں جاننا چاہتا ہوں کہ میری اماں اس وقت کیا کر رہی ہے۔"

عبدالشکور کو ضرور اس خواہش پر مایوسی ہوئی ہوگی۔ اس کے دماغ میں اس خشک اور بے معنی خواہش کی جگہ کوئی اور خواہش ہوگی کہ وہ اُو پر ان سب آدمیوں سے اُوپر ہوائی جہاز میں اُڑ رہا ہو یا یہ کہ اس کے سکول کے سبق خود بخود ہی اسے یاد ہو جایا کریں سامعین میں سے بیشتر نے بھی یہی سوچا ہوگا (کم از کم میں نے تو یہی سوچا) کہ حضرت سلیمان کو اس بے معنی اور بے فائدہ غرض کے لئے اس قدر تکلیف دینا حماقت ہے......

مگر سب سے زیادہ مایوسی یقیناً عبدالشکور کی تھی جو اس وقت اپنے گھر کے متعلق جاننے کا ذرا بھی مشتاق نظر نہ آتا تھا، آخر یہ جاننے کا فائدہ ہی کیا کہ اس کی ماں کیا کر رہی تھی یا آیا وہ کچھ کر رہی ہے یا نہیں۔ میں اس کے احساسات بتا سکتا ہوں کیونکہ میں بھی ایک دفعہ عبدالشکور تھا!

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ میری ماں اس وقت کیا کر رہی ہے" اس نے نکمے پن سے کہا۔

"اب دیکھو! شاہ سلیمان مشکل کشا نے فغفور جن کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا ہے!"

"کیا ہے؟"

"شاہ سلیمان اس کو کچھ حکم دے رہے ہیں، عبدالشکور! شاباش غور سے سنو کیا حکم دے رہے ہیں۔"

"وہ حکم دے رہے ہیں کہ ــــ" لڑکا کچھ شک میں تھا اور اس نے بکرداڑھی کی طرف ایک ایسے سکول کے لڑکے کی نظر سے دیکھا جو کسی خوفناک اُستاد کے سامنے اپنے سبق میں رک رہا ہو.... حکم دے رہے کہ

"اصل میں شور بہت ہے۔ آواز سنائی نہیں دیتی"، بکرداڑھی نے مجمع سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "ہاں عبدالشکور! انہوں نے حکم دیا ہے کہ تمہارے مکان کا

اندر کا حصہ یہاں اپنی پیٹھ پر لاد کر تمہارے سامنے رکھے...... اچھا اب غور سے دیکھو۔ وہ تخت وغیرہ پریاں اڑا کر لے جاتی تمہیں نظر آتی ہیں۔"

"ہاں اُڑا کر اُوپر لے جا رہی ہیں۔"

"اور فغفور جن تمہارا مکان اُڑا کر لانے کے لئے پر تول رہا ہے...... اب دیکھو.... کیا تمہارا مکان اس نے تمہارے سامنے میدان میں لا اُتارا۔"

"ہاں لا اُتارا ہے"!

"اب ان سب آدمیوں کو اپنے مکان کی تفصیل بتاؤ۔"

عبدالشکور نے لوگوں کو بتایا کہ اُس کے مکان میں اتنے کمرے ہیں۔ اتنی کھڑکیاں ہیں۔ اُوپر جانے والی سیڑھیاں لکڑی کی ہیں۔ اسے اس تفصیل بتانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کیونکہ وہ اپنے مکان کو بیان کر رہا تھا۔ بکر داڑھی نے فاتحانہ طور پر سامعین کی طرف دیکھا۔

"کیا تم اپنی ماں کو دیکھ سکتے ہو؟"

"ہاں" عبدالشکور بولا۔

"وہ کیا کر رہی ہے؟"

"وہ چولہے کے پاس بیٹھی کھانا پکا رہی ہے۔"

"اس کے ساتھ کون ہے؟"

"چھوری بلی۔"

"شاباش! عبدالشکور...... " لڑکا بے حد خوش اور مطمئن پھر اپنے ساتھیوں میں جا بیٹھا اور بکر داڑھی کی مرعوب کن شکل کو تعجب سے وا آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

اس کے بعد اس نے ایک لمبی تقریر میں مجمع کو یقین دلایا کہ اس طلسمی انگوٹھی کی بدولت دُنیا کی ہر خواہش فوراً پوری ہو سکتی تھی حضرت سلیمان شاہ جنات کے توسط

سے نوکری حاصل کی جا سکتی ہے۔ کاروبار میں ترقی مل سکتی ہے اور سنگدل سے سنگدل
محبوب کا وصال گھر سے باہر قدم دھرنے کی ضرورت کے بغیر نصیب ہو سکتا ہے۔ اس نے
ان کو بتایا کہ اگر ان کو کچھ مرتبہ چاہیئے تو وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں کیونکہ خاک میں مل کر دانہ گل و
گلزار ہوتا ہے اور ان پر واضح کیا کہ کاغذ کے پھولوں سے کبھی خوشبو نہیں آ سکتی۔۔۔۔
صرف انگوٹھی کے استعمال کے لئے ایک شرط تھی۔ اگر بچہ ہے تو وہ اس پر کسی وقت بھی
عمل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ گیارہ سال سے اوپر کا نہ ہو۔ اس سے اوپر کے آدمی کے
لئے چند روز مشق کی ضرورت تھی جس کے دوران میں یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی پرائی عورت
کے نزدیک نہ جائے۔ جتنا پاک اور صاف کوئی شخص ہوگا اتنی ہی جلدی اس کو کامیابی
ہوگی۔ اس کے استعمال کے لئے عورت مرد بچے کی کوئی قید نہ تھی۔ مشق کے لئے یہ تھا۔
کہ آدمی ہر روز ایک تاریک کمرے میں بیٹھ کر پندرہ منٹ ٹکٹکی باندھ نگینے میں دیکھے اور اپنے
دل میں کسی قسم کا کوئی گندہ خیال نہ لائے۔ دس بارہ روز کی مشق کے بعد اسے انگوٹھی کے
نگینے میں فغفور جن نظر آنے لگ جائے گا جس کے توسط سے وہ سلیمان مشکل کشا کے
دربار میں رسائی پا کر اپنی عرض پیش کر سکتا ہے اس نے سامعین کو یقین دلایا کہ اسے روپیہ
پیسے کا مطلق لالچ نہیں۔ خدا کے فضل سے گھر میں کھانے پینے کو ہے۔ یہ انگوٹھیاں دے
کر وہ صرف اپنے والد ماجد بہشتی علیہ رحمتہ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے اور اس کا مقصد
بجز خدمتِ خلق خدا کے جس کا اجر اس کو اگلے جہاں میں خداوند تعالےٰ دے گا اور کچھ
نہیں۔ ڈھائی تین روپے تو صرف ان انگوٹھیوں کی بنائی اور گھڑائی پر ہی لاگت آ جاتی ہے
وہ ان سے محض ایک روپیہ ہدیہ مانگ کر دو روپے فی انگوٹھی کا نقصان اٹھا رہا ہے۔
یہ انگوٹھی وہ شخص اس جگہ ہی ایک روپے میں دے رہا ہے، اگر اس کے مکان نمل دے
اسٹریٹ، چاکی واڑا پر اس سے یہ انگوٹھی مطلوب ہو تو اسی انگوٹھی کا ہدیہ ساڑھے
پانچ روپیہ ہوگا۔ اس نے سامعین کو بتایا کہ وہ عرصہ دس سال سے پروفیسر فقیر لوک

موجد طلسمی انگوٹھی کے نام سے ان میں موجود ہے اور یہی اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ نقال نہیں۔ اس کے پاس ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں، افسروں، انشورنس ایجنٹوں اور بڑے بڑے لوگوں کے سرٹیفکیٹ اور خطوط تھے جن میں انہوں نے اس انگوٹھی کی کرامات کی بے حد تعریف کی ہے۔ بعض مہاراجوں نے اسے اپنی ریاست میں وزیر اعظم بنانے کی پیش کش کی تھی مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ وہ صرف سلیمان مشکل کشا کا فیض عام کرنا چاہتا تھا۔

"آپ میری اس داڑھی کی طرف دیکھیں" اس نے کہا "اگر میں اس داڑھی کے ساتھ جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت۔ ساری دنیا مجھ کو جانتی ہے۔ پروفیسر فقیر لوک ہر جگہ مشہور ہے۔ میں ان دوسرے اشتہار بازوں اور حکیموں کی طرح نہیں جو پبلک کو دھوکا اور فریب دیتے ہیں اور ایک جگہ لوگوں کو ٹھگ کر اس طرح رفو چکر ہوتے ہیں کہ پھر سالوں تک نظر نہیں آتے۔ میں عرصہ دس سال سے چاکی واڑا میں مقیم ہوں۔ میرا گھر کا پتہ فلیٹ نمبر دس منزل دوسے اسٹریٹ بلڈنگ مقابل مطب ڈاکٹر غریب نما ہے..... دریا منظر العجائب! یہ تو شیخ قربان علی کمار کے مکان کا پتہ تھا!) اگر میں دھوکا کر رہا ہوں یا انگوٹھی میرے دعوے پر پوری نہ اترے تو آپ مجھ سے میرے اس پتہ پر ملیں۔ میں عموماً دہیں ملوں گا۔ میں اس صورت میں آپ کے دام واپس کرنے کی گارنٹی کرنے کو تیار ہوں۔"

اس کے الفاظ کی نیک نیتی اور خلوص میں کچھ شک نہ تھا اس نے ان کو اپنے گھر کا پتہ تک بتا دیا تھا۔ (جو درحقیقت شیخ کمار کے گھر کا پتہ تھا!)..... خود مجھے اس کی سچائی اور انگوٹھی کی کرامات کا یقین ہونے لگا۔ اس کی فصاحت، جادو بیانی اور اپنے سامعین کو اکسانے کی طاقت سچے عاملوں کی بہترین روایت میں تھی......

مجمع میں کھڑے ہوتے ایک فوجی نے پہل کی۔ اس نے ایک روپے میں سلیمانی انگوٹھی خریدی اور چار آنے میں سلیمانی تیل کی چھوٹی شیشی جو نگینے کو چمکانے کے لئے ضروری تھی۔

نیلی یونیفارم میں ایک نیوی والے نے بری فوج کو نیچا دکھانے کے لئے دو انگوٹھیاں خریدیں (بری اور بحری فوج میں ایک قسم کی صحت مندانہ رقابت ہے اور وہ ایک دوسرے کو کسی بات میں بڑھنے نہیں دیتے) نیوی والے کے چہرے پہ فاتحانہ نظر تھی جیسے اس نے بحری فوج کی لاج رکھ لی ہو۔ ایک دفعہ جو طلسم ٹوٹا تو انگوٹھی کے لئے مجمع میں سے دھڑا دھڑ فرمائشیں آنے لگیں اور ہاتھ بلند ہونے لگے۔ جاکی واڑا کے شہری اپنی مالی، جنسی اور جنسی مشکلات کا حل اتنا قریب پاکر روپے بڑھا بڑھا کر بکر دھاڑی کو پیش کرنے لگے۔ ایک انگوٹھی ادھر دیتا! مولوی صاحب، پیر صاحب! دو سلیمانی انگوٹھیاں مجھے دیتا،،

"یہ موقعہ پھر نہ آئے گا"، بکر داڑھی انگوٹھیاں اور شیشیاں اپنے گاہکوں میں تقسیم کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "یہاں اس کا ہدیہ صرف ایک روپیہ ہے۔ گھر پہ لوگے تو ساڑھے پانچ روپیہ۔ اگلے مہینے تک یہ انگوٹھی ایک ہزار روپے میں بھی نہ ملے گی۔ اس مہینے کے بعد میں انگوٹھیاں دینا ختم کر رہا ہوں کیونکہ فغفور جن نے مجھ سے گڑگڑا کر التجا کی ہے کہ حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرتے کرتے وہ اتنا عدیم الفرصت ہو گیا ہے کہ اسے کھانا کھانے یا سونے کا وقت میسر نہیں ہوتا۔۔۔۔۔،،

جاکی واڑیوں کے سُنتے ہوئے چہرے دمکتے جاتے ان کی آنکھیں حریصانہ طور پر چمکنے لگتیں۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ طلسمی انگوٹھی ان کی سب مشکلات کا حل ہے۔ اب وہ تھوڑی سی مشق کے بعد اپنے دل کی عزیز ترین خواہشیں پوری کر سکتے تھے، وہ ساری دولت کے انبار سمیٹ سکتے تھے، وہ محل بنوا سکتے تھے، وہ انواع و اقسام کے کھانے کھا سکتے تھے۔ ان میں سے کئی ہونٹوں پہ بھوکی اور لالچی زبانیں پھیر رہے تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ بکر داڑھی کا چہرہ اور آواز اس قدر شناسا کیوں ہے اور میں نے اس کو کہاں دیکھا ہے میرا یہ بھی ارادہ تھا کہ جب اسے انگوٹھیاں بیچنے سے فراغت ہو تو اس سے پوچھوں کہ یہ گاؤن اور ٹوپی اس کو کہاں سے ہاتھ لگے اور اسے واضح کر دوں کہ

یہ میرے ہیں اور یہ کہ میں نے ان کو شیخ قربان علی کنار کو ایک دو ہفتے کے لئے اُدھار دیا تھا۔۔۔۔
پھر یکایک مجھے خیال آیا۔ یہ شخص تو پروفیسر شاہسوار خاں ہے۔"

یہ خیال آتے ہی میں نے غوطہ لگا کر پیچھے بھاگنے کی ٹھانی اور مڑا ہی تھا کہ اپنے سامنے شیخ قربان علی کنار کو کھڑا ہوا پایا۔ وہ اپنے گاؤن اور ٹوپی کے بغیر تھا اور ان کے بغیر اس کو پہچاننا مشکل نہ تھا۔

"سناؤ یار چنگیزی" اس نے کہا "کہاں غائب ہو گئے تھے! سنی ہے حضرت فقیر لوک صاحب کی تقریر؟"

"کنار" میں بولا "مجھے یہ بتاؤ تم نے اس کو میرا گاؤن اور ٹوپی کیوں دیئے ہیں۔ میں نے نہیں یہ اس لئے تو نہ دیئے تھے کہ تم دوسروں کو آگے اُدھار دیتے پھرو گے" اس کو کہو انہیں اتار دے ـــــ میں چلتا ہوں ـــــ اور میں چلنے لگا۔

"ٹھہرو چنگیزی یار! فقیر لوک صاحب سے نیاز تو کر لو۔ میں تمہارا تعارف کرادوں گا۔"

"نہیں مجھے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ فقیر لوک نہیں بلکہ یہ پروفیسر شاہسوار خاں ہے ـــــ اس نے لوگوں کو تمہارے گھر کا پتہ بتایا ہوا ہے۔ کیا وہ تمہارے ہاں آکر ٹھہرا ہوا ہے؟"

"ہاں وہ تین دن سے میرے ہاں ٹھہرا ہوا ہے" کنار نے اقرار کیا۔ "مگر وہ آج شام کو پنجاب کے دورہ پر جا رہا ہے۔ وہاں آج کل سیلابوں وغیرہ کی وجہ سے لوگوں پر مصیبتیں ٹوٹی ہوئی ہیں اور انہیں اس کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے اسے اور ٹھہرنے کے لئے درخواست کی مگر شاہسوار خان نے فرمایا "کنار۔ خدا کی رعیت" المدد، المدد" پکار رہی۔ اور سیلابوں کی وجہ سے وہاں انگوٹھیوں کی فروخت کا بڑا موقع ہے۔"

"اور پنجاب کے دورہ کے بعد؟"

"پنجاب کے دورہ کے بعد وہ پھر میرے پاس آکر ٹھہرے گا حتیٰ کہ ملک میں کوئی اور سیلاب

یا ایسا کوئی سانحہ پیش نہیں آتا" اور مصیبت زدہ مخلوق اس کو مدد کے لئے نہیں بلاتی۔"

"تمہارا مطلب ہے اس نے اب مستقل رہائش تمہارے پاس اختیار کر لی ہے؟"

"پروفیسر شا ہسوار مجھے اپنے بھانجے کی طرح محبت کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ میں اسے اپنے ایک بھانجے کی یاد دلاتا ہوں جو عرصے سے لاپتہ ہے۔"

"کٹار! تم غلطی کر رہے ہو" میں نے اسے تنبیہہ کی "یہ پروفیسر شاہسوار خاں ایک جونک ہے۔ تمہاری مالی حالت ایسی استوار نہیں کہ تم اس کو اور اس کے ساتھیوں مثلاً بدلے وغیرہ کو اپنے پاس رکھ سکو۔ یہ مصیبت مول لے کر تم نے اپنے گدھے ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تاتیخی اور لافانی دوستی کی خاطر اللہ توکل، ہوٹل تمہارے ساتھ پر وفیسر اور معتوب جنوں کے لئے بھی پلاؤ اور حلوے مہیا کرے گا تو یہ تمہارا خیال غلط ہے۔"

"خیر! دیکھیں گے!" کٹار نے اطمینان سے کہا "اس وقت تو میرا پروفیسر کو اپنے ہاں رکھنے کا سوال ہی نہیں۔ وہ ایک طرح مجھے رکھ رہا ہے..... اور یہ کاؤن اور ٹوپی میں نے اسے یونہی نہیں دیئے! انگوٹھیوں کی فروخت میں میرا دس فیصدی کمیشن ہوگا۔"

میں نے کبھی قربان علی کٹار کو کاروباری فراست سے اس قدر متصف خیال نہیں کیا تھا۔ اور مجھے ایک تعجب سا ہوا اور خوشی سی بھی اور میں ایک وقفہ کے لئے بھول گیا کہ اس کاروباری فراست کا اظہار میرے گاؤن اور ٹوپی پر ہو رہا ہے "اور" قربان علی کٹار نے کہا "اس نے اپنی طلسمی انگوٹھی مجھے بھی آدھے ہدیے پر فروخت کی ہے اور تم نے خود پروفیسر شاہسوار کے منہ سے سن ہی لیا ہوگا کہ یہ تقریباً اتنی ہی مفید ہے جتنا الہ دین کا چراغ۔ اور الہ دین کے چراغ سے زیادہ ہلکی تم اس کو کہیں بھی پہن کر جا سکتے ہو۔ دفتر میں یا شاہراہ پر ریستوران یا ایرانی کیفے میں یا سینما گھر میں۔ ذرا تصور کرو اگر الہ دین کے چراغ کو ہاتھ میں پکڑ کر تم کسی سینما گھر میں داخل ہو تو ہر ایک شخص تمہاری طرف دیکھنے لگ جائے گا۔ تم تماشہ بن جاؤ گے۔"

میں نے اتفاق کیا کہ یہ یقیناً الہ دین کے چراغ سے بہتر شے ہے، مگر مائی ڈیئر قربان علی کٹار"

میں نے کہا " مجھے یہ بتاؤ کہ پروفیسر شاہسوار خاں اب مولوی فقیر لوک کیوں بنا ہوا ہے اور اس نے یہ نوکدار مونچھیں کہاں سے لی ہیں؟"

" اس پیشے میں کچھ خطرات ہیں" قربان علی کٹار نے کہا " یہاں بعض ایسے شخص موجود ہیں جو پروفیسر کے خون کے پیاسے ہیں اور کل ہی ایک شخص نے مڈل وسے اسٹریٹ میں اپنی کھڑکی میں سے پروفیسر کو گالیاں دیں اور اس کے سر پہ لوٹا پھینکا۔ اس لئے وہ بھی شہر میں اور شمع کے سامنے مختلف ناموں سے ظاہر ہوتا ہے۔"

میرے دوسرے سوال کا جواب پروفیسر شاہسوار خاں نے خود ہی آکر دے دیا۔ شمع اب تر بتر ہو چکا تھا اور اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر اپنی نوکدار مونچھیں اُتار کر تھیلے میں ڈالیں وہ مجھ سے اسی طرح مخاطب ہوا جیسے اُتارنے یا پہننے میں کوئی غیر معمولی چیز نہ ہو۔

" سناؤ۔ برخوردار اقبال حسین" اس نے اپنی پاٹدار آواز میں کہا جسے سُن کر میرا دل بیٹھ گیا۔

" تم اس دن کے بعد نظر ہی نہیں آئے! ایک دن تم کو شیخ قربان علی کٹار طوطمرہ کے ساتھ دلی مارکیٹ، میں دیکھا تھا مگر تم ایسے غائب ہوئے کہ میرے دو گھنٹے تمہیں تلاش کرنے پر بھی نہیں ملے...... سناؤ! تم کو بھی ایک طلسمی انگوٹھی چاہئیے" اس نے اپنی تھیلی میں ہاتھ ڈالا۔

" نہیں! نہیں! پروفیسر" میں نے شدت سے کہا " مجھے ضرورت ہوئی تو میں تم کو بتادوں گا۔ فی الحال دنیا مجھ پہ مسکرا رہی ہے۔ میں کسی ایسی مشکل میں نہیں جس میں طلسمی انگوٹھی کارآمد ہو نہ میں کسی مقدمے کے بکھیڑوں میں پھنسا ہوں، نہ مجھے کوئی امتحان پاس کرنا ہے۔ نہ مجھے ملازمت کی ضرورت ہے۔"

" اور برخوردار وصال محبوب تمہیں نصیب نہیں" وہ کڑکڑایا " یہ تمہاری شکل سے ہی ظاہر ہے۔ مغفور جن کو تابع کرکے اُسے حکم دو کہ آکر دروازہ کھولے اور تیرا محبوب باہر ہاتھ

باندھ کر نہ کھڑا ہو تو پروفیسر شاہسوار خان آدمی نہیں گھوڑا ہے۔"

"پروفیسر! ملاہدی، مس میبی اور نزیچہ وغیرہ کہاں ہیں"؟ میں نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

"وہ معتوب جنات میں سے تھے جنہوں نے حضرت سلیمان مشکل کشا کی اطاعت سے انکار کر دیا تھا۔ پچھلی دفعہ جب میں ملک جنات میں تھا تو سلیمان بادشاہ نے مجھے فرمایا تھا کہ شاہسوار خان ان کو بطور سزا کے اپنے ساتھ ہمراہ لیتے جاؤ۔ پرسوں وہ تینوں تو بہ تائب ہو گئے اور میرے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ قطب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پچھلا کیا کرایا معاف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے سلیمان مشکل کشا کو تار عنکبوتی سے پیغام بھیجا۔"

"ذرا ٹھہرو! پروفیسر!" میں نے کہا۔ "اتنا تیز نہیں۔ اگر تم نے تار پر سے پیغام بھیجا اس سے کیا یہ سمجھا جائے کہ تم نے حضرت سلیمان سے ٹیلیفون پر بات کی۔"

"قطب جب چاہیں سیدھے اس مشکل کشا سے بات کر سکتے ہیں" اس نے جلال میں کہا۔

"جس طرح تم دنیا والوں کے یہاں ٹیلیفون ہیں اسی طرح ہم اللہ والوں کی بھی وائرلیس چلتی ہے۔"

"اچھا لو پروفیسر! تم نے پیغام بھیجا......؟"

"میں نے پیغام بھیجا ہیلو شاہسوار خاں بول رہا ہے۔ حضور والا وہ تینوں جن تائب ہو گئے ہیں اور گڑگڑا کر عرض کرتے ہیں کہ ان کا قصور معاف کیا جائے سلیمان مشکل کشا نے فرمایا کہ ان کو لے کر فوراً بارگاہ میں حاضر ہو جاؤ۔ چنانچہ ان جنات کو ساتھ میں لے کر بھر ملک جنات میں پہنچا۔"

"کس طرح"؟ میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے پروفیسر تمہارا جانے کا طریقہ کیا تھا میرا مطلب ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ سلیمان بادشاہ نے اپنا کوئی جن تمہیں لانے کے لیے بھیجا تھا۔"

" یہ باتیں نہیں پوچھا کرتے برخوردار۔" شاہسوار نے جواب دیا۔ "اچھا تم پوچھتے ہو تو میں اس دفعہ براق پر گیا تھا۔"

" اور وہ معتوب جن تمہارے ساتھ براق کی پیٹھ پر بیٹھے ہوں گے۔"

اس دفعہ شاہسوار خاں نے مجھے جان کر کہ میں اس کا مذاق اُڑا رہا ہوں مجھے قہر کی نگاہ سے دیکھا اور مڑ کر قربان علی کٹار سے مخاطب ہوا۔

" برخوردار، اب کہیں چائے پیئیں "

میں نے اس وقت چپکے سے کھسکنے کی کوشش کی۔ پچھلی چائے کا وقوعہ ابھی تک میرے دماغ میں تازہ تھا۔ مگر شیخ قربان علی کٹار میرے وجود سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے میں کوشاں رہتا ہے۔

" کہاں جا رہے ہو چنگیزی یار،" کٹار نے شکایتاً کہا۔ " آج شاہسوار خاں کو شابزان ہوٹل میں چائے پلائیں۔"

" شابزان،" میں نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا . . . . پھر میں زیرلب بڑبڑایا کہ میں سوشلسٹ ہوں اور اصولاً ایک ایسے ہوٹل میں جہاں استعمار پسند طبقہ چائے پیتا ہے چائے نہیں پیتا۔

" برخوردار، چلو" اچانک پروفیسر شاہسوار خاں نے میری گردن کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔ " اقبال حسین! بزرگوں کی صحبت روز روز کہاں میسر ہوتی ہے۔ مجھ سے دور نہ رہا کرو۔ شاہسوار خاں بڑے کام کا آدمی ہے۔ تم کو پارس بنادے گا آج میں پنجاب کے دورہ پر نکل رہا ہوں۔ چار مہینے تک ادھر کو آؤں گا۔"

" پاکستان ایکسپریس ؟" میں نے جلدی سے کہا۔ " اس کا تو وقت ہو گیا ہے۔ گاڑی کے چھوٹنے میں آدھ گھنٹہ رہتا ہے سیدھا اسٹیشن پر ملنا چاہیئے۔ او گاڑی ! گاڑی ! رکشہ !"

" نہیں برخوردار میں پاکستان ایکسپریس سے نہیں جا رہا اور پھر فقیروں کی دعا سے میں گاڑی کو حیدرآباد بھی پکڑ سکتا ہوں اور اگر جا ہوں تو وہ یہیں اس وقت تک کھڑی رہے جب تک میں اس میں نہ چڑھ جاؤں اور پہیے لائن سے بندھے رہیں ——— میں آدھی رات کو اڑن کھٹولے پر جاؤں گا۔"

شاہزان راسٹوران جانے کے لئے ہم نے ایک گاڑی کو ٹھہرایا۔ میں پروفیسر کو سمجھانا چاہتا تھا کہ وہاں اُس کے اُڑن کھٹولے میں یا فغفور جن کی پیٹھ پر چڑھ کر ہمارا پہنچنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اس سے شاہزان کے بورژوا گاہک بے حد متاثر اور مرعوب ہوں گے۔ جب وہ شیشوں میں سے اپنی چمکتی موٹر کاروں کے پاس آسمان سے ایک اُڑن کھٹولے کو اُترتے اور اس میں سے پروفیسر اور اس کے بالکل پرو لتاری ساتھیوں کو برآمد ہوتے دیکھیں گے تو یہ ان کے بے حد رشک اور تعجب کا موجب ہوگا اس سے ان کی بورژوا آسودہ خاطری کو دھچکا لگے گا۔"

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور وکٹوریہ میں بازاروں میں سے ہوتے ہوئے بندر روڈ کے راستے سے وکٹوریہ روڈ پر گئے۔ پروفیسر نے اپنی چوکور ٹوپی اتار دی تھی اور اس کے مہندی سے سُرخ اُلجھے ہوئے لمبے بال بے حد غلیظ تھے۔ ان بالوں میں جوؤں کی بھرمار تھی۔ اس نے ایک ساری سیٹ پر اپنے وسیع جسم کو پھیلایا ہوا تھا ایک آرام اور راحت کے انداز میں مجھے یقین تھا کہ فغفور جن، اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوگا۔ میں اور شیخ قربان علی کنار دونوں مخالف کی چھوٹی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی مضحکہ خیزی کے باوجود پروفیسر کے چہرے پر ایک قسم کا جلال ضرور تھا۔ ممکن ہے اس کی انگوٹھی کی کرامات سچ ہی ہوں۔ اگر قطب ہوتے ہیں تو پروفیسر یقیناً قطب تھا۔

شاہزان راسٹوران پر پہنچ کر میں نے گاڑی والے کے دام چکائے۔ راسٹوران کی پیلی صندوق نما مکعب کے سامنے سُست امیروں کی چمکیلی موٹریں (میں سوشلسٹ ہوں!)

ایک دوسرے سے اپنی چمکیلی جدید ناک بھڑاتی ہوئی کھڑی تھیں۔ میں کچھ کچھ ڈر رہا تھا کہ کہیں پروفیسر کو اندر جانے سے منع نہ کر دیا جائے مگر اگر کسی کے دل میں ایسا خیال آیا بھی تھا تو پروفیسر کے جلال کو دیکھ کر اس نے کچھ کہنے کی جرأت نہ کی۔ ہمارا داخلہ سارے راستوران میں ایک سنسنی سے آیا اور کئی بورژوے چائے کی پیالیوں کو ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے رُک گئے۔ کئی بورژوے مسکرائے۔ ویسی ہی مسکراہٹ جو بورژوے پرولتار کے ایک خاص طور پر بد حال نمونے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ مگر پروفیسر کی سبزی مائل آنکھوں میں فی الواقع ایک ایسا جلال سا تھا کہ بورژوا مسکراہٹ اس کے سامنے فوراً مرجھا جاتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ پروفیسر شاہزاں میں اس طرح ایٹ ہوم اور آسودہ دل محسوس کر رہا تھا کہ وہاں بیٹھا ہوا دولت مند سے دولت مند بورژوا بھی نہ کرتا ہوگا۔ میں کچھ بے چین اور بوکھلایا ہوا تھا، قربان علی کتار اس احسان سے بالا ہے اور میری شرماہٹ اور بوکھلاہٹ کا موجب پروفیسر بالکل ایسا مطمئن اور فاتح سا لگ رہا تھا جیسا کہ یہ راستوران چا کی واڑ اکا گارڈن ہو اور یہ چلتے سرکتے ہوئے بورژوے بہت سی اینٹیں۔ پروفیسر ان خوش قسمت آدمیوں میں سے تھا۔ جن کے لئے پرولتاری اور بورژوے الگ الگ وجود نہیں رکھتے۔ وہ سب اس کے لئے آدمی ہیں، اس کے سامعین، اس کی فصاحت کے لئے موسیقی کے آلے جن کو وہ بجا سکتا تھا۔ اور جن کے تاروں سے وہ سُر نکال سکتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ پھر بھی میں سوچ رہا تھا کہ اگر پروفیسر اور ہم یہاں اپنے اُڑن کھٹولے یا فغفور جن پر اُڑتے ہوئے آتے تو وہ زیادہ ڈرامیٹک ہوتا اور ہماری عمومی وضع قطع کے زیادہ مطابق۔

راستوران کے اندر ہر ایک چیز سُرخ تھی۔ دیواریں ہلکی گلاب کے پھولوں کی طرح سُرخ تھیں۔ نیچے فرش چوبی سُرخ تھا اور فرنیچر سُرخ تھا۔ ظاہراً اُس راستوران کو کسی سُرخ اشتراکی نے بورژواؤں کی تفریح اور ان کی جیبوں میں سے پیسے بٹورنے کے جذبے تعمیر کیا تھا۔ بیروں کی وردیاں بھی سُرخ تھیں۔ ہم پروفیسر کی بھڑکیلی قیادت میں بلوش

قالین میں سے دھنستے ہوئے اندر کے ڈائننگ ہال کی ایک میز پر جا بیٹھے۔ پروفیسر نے اپنے انگوٹھیوں کے تھیلے، سوٹے اور ٹوپی کو میز کے اُوپر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو صوفے میں استراحت کے لئے تیار کیا مگر میں نے اس کے اس ارادہ کو تاڑ کر اسی صوفے پر خود ہی بیٹھ گیا تاکہ اس پر سونے کے لئے جگہ نہ رہے۔ دوسرے دونوں سنگل صوفے تھے...... اس سنٹیبل ہال میں فضا پر سکون اور خاموش اور اُداس سی تھی اور یہاں تم ایسا محسوس کرتے جیسا تم کسی مصری فرعون کے حرم کی خلوت میں بیٹھے ہو۔ میں نے سُرخ رنگ کو ہمیشہ چمکیلا اور شوخ رنگ سمجھا ہے۔ خوشی اور جوانی اور بغاوت کا رنگ مگر یہاں اس ہال میں سُرخ ایک موزوں ماتمی، مقبرانہ رنگ ہو گیا تھا اور سیاہ بھی اس بارے میں اتنا مکمل تاثر شاید نہ دیتا۔ یہ اس قسم کا راستوران تھا جس میں شاید تم دفن ہونا پسند کر سکتے۔ اوپر سے بنون روشنیاں ادب سے خوش اخلاقی سے نور برسا رہی تھیں؛ اور پھر تیلے بلی کی چاپ والے سُرخ باور دی بیرے چلتے کی طشتریاں اُٹھائے ایک دوسری دنیا کے نورانی جسموں کی طرح ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔

وہ جن ہے،، پروفیسر شاہسوار نے ایک چھوٹے مسخرے سے بیرے کے طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنی اس اطلاع کی تشریح کرتے ہوئے کہا ،،اکثر یہ جنات شوق کے لئے یہاں اہل زمین کے پاس ملازم ہو جاتے ہیں اور یہاں کے حالات معلوم کر کے ملک جنات کے پولیس کے محکمہ میں بتاتے رہتے ہیں۔ یہ دراصل حضرت سلیمان بادشاہ کی طرف سے اہل زمین پر جاسوسی کرتے ہیں۔،،

یہ جاننے کے بعد کہ اس راستوران میں ایک جن بھی تھا ہم قدرتاً کچھ مضطرب سے ہو گئے۔

[illegible]

سے پوچھا۔ بیرے کے چہرے پر بوکھلاہٹ کی علامت آئی اور اس نے شاہسوار خاں کے چہرے کو غور سے اور حیرانی سے دیکھا جیسا اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"مولوی صاحب! مجھے یاد نہیں پڑ رہا کہ آپ سے کہاں ملاقات ہوئی تھی؟" بیرے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اس نے ظاہراً شاہسوار خاں کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

میرے نزدیک کوئی وجہ نہ تھی کہ شاہسوار خاں، بیرے کو پہلے سے جانتا ہو مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ جیسا کہ ظاہر تھا اور جس کی بعد میں بھی تصدیق ہو گئی بیرے کا نام واقعی محمد دین تھا!

"اچھا بھئی محمد دین" شاہسوار خاں چھوٹے چھریرے بیرے کو اس کے نام سے بلانے پر مصر تھا (جس طرح گھر میں ایک خوش طبیعت آقا اپنے نوکر کو بلاتا ہے) "تم ہم کو کیسے پہچانو گے۔ سلیمان شاہ کے ہاں سے کب آئے؟"

"وہ تو جی کچھ دو مہینے کے قریب ہو گئے۔" بیرے نے کہا "دو مہینے سے کوئی خبر نہیں آئی۔ اب بلائیں گے تو جاؤں گا۔ ادھر خوب عیش تھے"

میں نے بدقت گلے میں سے ایک ایسی چیز اُتاری جو وہاں نہ تھی۔ پروفیسر شاہسوار خاں نے میری طرف جلالی فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔

"صاحب! چائے لاؤں" بیرے نے کہا۔ "کیک پیسٹری"

"بھئی محمد دین" "میں تو چائے نہیں پیوں گا" پروفیسر نے کہا "مجھے تو پیڑوں کی لسی پلوا دو۔ برف ڈال کر۔"

میں نے اس عجیب و غریب مشروب کا ذکر پہلی بار سنا تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ دنیا میں ایسی ہستیاں بھی ہیں جو پیڑوں کی لسی بنا کر پیتی ہیں..... میں نے یہ دیکھ کر اگر پروفیسر بات چھوڑ دی گئی تو وہ کبھی ٹھیک آرڈر نہ دے گا اور ارد گرد کے کئی لوگوں کی ادھر توجہ کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے بیرے کو ٹھنڈے دودھ پیڑوں کا آرڈر دیا۔

"اور آدھ سیر تازہ جلیبیاں بھی،" پروفیسر شاہسوار خاں نے ایک اونچی آواز میں آرڈر کی تکمیل کی اور پھر میری طرف خطاب کر کے "دودھ میں ڈال کر کھائیں گے۔"

چھوٹے بیرے کے چہرے پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ تھی ــــ بورژوا ہوٹلوں کے بیرے بھی بے حد بورژوا ہوتے ہیں۔ اس نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور آرڈر لئے چلا گیا ــــ وہ تھوڑی دیر میں دودھ اور پیسٹریاں لے آیا اور ان کو میز پر رکھ کر جلدی سے بھاگ گیا جیسے اسے ایسے بدمذاق لوگوں کی خدمت کرنا ناگوار ہو۔

"ارے بھئی محمد دین، جلیبیاں۔" پروفیسر چلایا۔ مگر اس دوستی اور قربت کے انداز کے باوجود محمد دین جن غائب ہو گیا۔

"اس نے اصل میں مجھے اچھی طرح پہچانا نہیں،" شاہسوار خاں نے پیسٹریوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا۔ ایک نہایت شدید اور گہری توجہ کچھ عرصہ کے لئے گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ اور پروفیسر اور شیخ کمار ماکولات پر اس طرح پل پڑے جیسے وہ دو دن کے بھوکے ہوں ان کو کھاتے دیکھنا میرے لئے قابلِ فہم اور واضح وجوہات کی بنا پر ایک اذیت تھا، بل مجھ ہی کو ادا کرنا تھا۔

جب میز پر سب پلیٹیں صاف ہو گئیں اور دودھ کے گلاس خالی ہو گئے، پروفیسر شاہسوار خاں نے ایک زبردست ڈکار لی۔ شاید زبردست ترین ڈکار جو اس "الاٹ" کے ریستوران میں کسی نے نہ لی ہو گی اور جس نے اس کمرے میں بیٹھے ہوئے سب بورژواؤں کی نظر پروفیسر کی طرف مرکوز کر دی۔ میں نے ایک بورژوا عورت کو جو ایک پھولدار غرارہ پہنے ہوئے تھی۔ ڈر کر اپنی چائے کی پیالی کو نیچے فرش پر گراتے سنا۔ اس نے غالباً سمجھا تھا کہ کوئی مرکھنا درندہ شابزان میں گھس آیا ہے۔ پروفیسر اس ہلچل سے جو اس نے پیدا کر دی تھی۔ قطعاً بے پروا اور غیر متاثر تھا۔

"برخوردار اقبال حسین۔ آواز دو بھئی اس محمد دین کو،" شاہسوار خاں نے بلند آواز میں

کہا، کچھ اور کھانے کے لئے لائیے۔ کچھ لطف نہیں دیا۔ ان انگریزی پیسٹریوں نے۔ جو مزہ ہے لاہور کے ملا حسین حلوائی کی تازہ جلیبیوں میں وہ ان پیسٹریوں ویسٹریوں میں کہاں۔“

اتنے میں میری نظر سامنے کی میز پر پڑی۔ وہاں میرا دوست کرنل سلجوقی ایک خوبصورت سی عورت کے ساتھ بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا جو اس کی نئی بیاہتا بیوی تھی۔ اس وقت میں دنیا کی سب سے آخری چیز جو چاہتا تھا یہ تھی کہ واقف مجھے اس عجیب صحبت میں نہ دیکھیں اور قدرتاً میں بہت کچھ بدحواس سا ہو گیا۔ سلجوقی نے ضرور مجھے دیکھ لیا ہوگا ——

دوسری میز پر میری نگاہ گئی تو میرے خدا! وہاں محمد منیر تنویر اور اللہ توکل کمپنی کے چند سابق ڈائرکٹر اللہ توکل کمپنی کی ایک سابق سٹینو ٹائپسٹ کی معیت میں بیٹھے ہماری طرف دیکھ کر اشارے کر کے مسکرا رہے تھے۔

محمد منیر تنویر، امپورٹ ایکسپورٹ کے نپولین نے مجھے آواز دی، ”مسٹر اقبال“
اب مجھے اُٹھ کر ان کی میز پر جانا ہی پڑا۔ کیونکہ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

”آؤ بھئی اقبال،“ تنویر نے کہا، ”اس جانگلی کو پکڑ کر کہاں سے لے آئے ہو۔“

”کون سا جانگلی،“ میں نے ظاہراً متعجب ہو کر کہا، ”آہستہ بولو۔ تم جانتے ہو یہ کون سے شخص ہے۔“

”کون ہے؟“ محمد منیر تنویر نے پوچھا۔

”یہ مشہور پولش گویا ہے —— پروفیسر برانوسکی ——“

”ابے جاؤ!“

”نہیں واقعی یہ پروفیسر برانوسکی ہے —— یہ ذرا وہمی اور عجیب الہیئت ہے جیسے کہ بڑے گویئے ہوتے ہیں مگر میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک جینیس ہے یہ سات سال سے بمبئی میں رہتا ہے۔ جرمنوں کے حملے کے وقت اسے اپنے ملک سے بھاگنا پڑا تھا“.....

لطف یہ ہے کہ میں نے ان کو شاہسوار خاں کے پروفیسر برانوسکی ہونے میں یقین دلادیا اور مجھے "جینس" کا جمع کرنے والا جانتے ہوئے وہ مجھے اتنے بڑے گویے کو ہتھیانے پر رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے..... مگر عین اس وقت جب کہ ان کی نگاہوں میں میری قدرو منزلت چڑھ رہی تھی پیچھے سے آواز آئی۔

"برخوردار اقبال حسین۔ دیکھو تو وہ محمد دین کہیں نظر آتا ہے یا نہیں، نظر آئے تو اسے جلیبیوں کے لئے کہہ دو۔"

"پروفیسر برانوسکی جلیبیوں کا بے حد شوقین معلوم ہوتا ہے،" محمد منیر نے آنکھ میں ایک کینہ ور ٹمٹماہٹ لئے ہوئے کہا۔

میں پھر واپس بھاگا اور پروفیسر کو خوش رکھنے کے لئے ایک دوسرے بیرے کو پھر دودھ اور پیسٹریوں کا آرڈر دیا (محمد دین غائب ہوگیا تھا) جونہی دودھ اور پیسٹریاں آئیں، وہی پہلی پل پڑنے کی داستان پھر دوہرائی گئی۔ پیسٹریوں پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد شاہسوار خاں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا وہ اب معلومات لٹانے کے موڈ میں تھا۔

"۔۔۔ ہاں تو برخوردار کرتار،" اس نے پتہ نہیں کہاں سے سلسلۂ گفتگو کا تار جوڑتے ہوئے کہا میں بتا رہا تھا کہ میرے دادا صاحب کے شاگردوں میں سے دو تین ایسے تھے جو جنات میں سے تھے۔ مگر جب میرے دادا اُن سے پوچھتے تھے کہ کیا تم جن ہو تو وہ صاف انکار کر جاتے اور کہتے کہ ہم بنی آدم ہیں۔ آخر ایک دفعہ میرے دادا نے پتہ لگانے کے لئے اپنے شاگردوں کو اکٹھا کیا اور اپنے لوٹے کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا۔ اچھا بھئی ایسا بہادر کون ہے جو اس لوٹے کے اندر اپنے آپ کو سما سکے۔ سب نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ مگر وہ لڑکا جو جن تھا شیخی میں آکر کہنے لگا کہ میں کر سکتا ہوں۔ چنانچہ سب کے دیکھتے دیکھتے وہ لوٹے میں داخل ہو گیا اور سما گیا۔ میرے دادا نے فوراً لوٹے کو اُوپر سے بند کر کے اس پر سورۂ یٰسین کی مہر لگا دی اور اس طرح اس جن کو اپنی حقیقت

استاد سے چھپانے پر سزا دی۔،، اس نے کنارکو اور مجھ کو جنات کے متعلق بعض عجیب و غریب معلومات مہیا کیں جو پیارے پڑھنے والے کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوں گی۔۔۔
پروفیسر شاہسوار کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ جن ہندو، سکھ اور مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ اور اس نے خود کئی جنات کو جو اسلام سے انحراف کر کے سکھ بن گئے تھے۔ بذریعہ تبلیغ پھر راہ ہدایت دکھادی تھی۔ ان کی شکلوں کے متعلق عموماً لوگوں کو غلط خیال ہیں۔ پروفیسر کی سند اس معاملہ میں بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے مطابق عام خیال کہ جنات کے سینگ یا دم ہوتی ہے محض توہمات ہیں۔ جنوں کی شکل بالکل انسان کی طرح ہوتی ہے۔ سینگ نہیں ہوتے۔ جن کے سینگ نہیں ہوتے۔ جن کے سینگ ہوتے ہیں وہ جنات سے مختلف قوم ہیں اور کئی لوگ لاعلمی کی بنا پر ان کو جنوں سے ملا دیتے ہیں۔ جنات کے قد عموماً چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں لمبے سے لمبا جن ساڑھے تین فٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہوتا۔ انسان اور جن کی ہیئت میں صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ جن کی آنکھیں کھڑی ہوتی ہیں اور ان کی لمبائی ناک کے متوازی ہوتی ہے۔،،

" اور لباس وغیرہ کیا ہوتا ہے،، کنار نے بے حد انہماک سے پوچھا۔

،، لباس۔ لباس یہی انسانی لباس۔ ہاں لباس فاخرہ ہوتا ہے۔ غریب جن بھی ہوتے ہیں جس طرح یہاں غریب آدمی ہوتے ہیں۔،،

۔میں نے سوچا کہ اس صورت میں غریب جن کمتر درجے کے ایرانی ہوٹلوں میں جاتے ہوں گے اور امیر جن شاید شاہزان راسٹوران میں۔ کیا جنات بھی بورژوا ئی وغیرہ ہوتے ہوں گے؟

" اور اس غضنفر جن کی شکل کیسی ہے،، کنار نے شیفتگی سے پوچھا۔

" تم اس کو خود بارہ دن کی مشق کے بعد دیکھنے لگو گے،، پروفیسر نے کہا: "غضنفر اچھا خوبصورت جن اور خوش اخلاق ہے اور اس کا قد بے حد چھوٹا ہے صرف دو فٹ۔،،

"اور۔ اور۔ یہ اگر آدمی کا کوئی محبوب ہو۔ تو اس انگوٹھی کے ذریعہ وہ گھر کے دروازے "
" سنگ دل سے سنگ دل محبوب خود بخود چل کر تمہارے کمرہ میں آجائے گا۔ اگر تم انگوٹھی
پہن لو سلیمان مشکل کشا سے جو خواہش تم کرو گے وہ پوری ہو کر رہے گی۔۔۔۔۔"

مجھے یقین ہے کہ ایسی شاندار اور پر مغز گفتگو کبھی اس ماتمی، وضعدار الوان میں کسی چائے کی میز پر نہ ہوئی ہو گی اور نہ ہی کبھی ایسے تین عجیب الہیئت شخص اکٹھے اس جگہ رستوران میں آئے ہوں گے۔ ہمیں وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی۔ اگرچہ میں جلد ہی بھاگنے کا آرزو مند تھا۔ کٹار نے پانچ چھ دفعہ پروفیسر سے انگوٹھی کی ترکیب استعمال دوہروائی۔ پروفیسر نے کٹار سے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ کٹار کے فلیٹ پر نہ چلے گا اور یہیں سے رخصت ہو گا۔ اسے ایک ضروری کام یاد آگیا تھا۔ وہ حکیم اللہ دتہ سنیاسی سے پنجاب کے دورہ پر روانگی سے پیشتر ملنا چاہتا تھا کیونکہ اس سے دنیا کی حکومتوں کے متعلق چند مشورے کرنا تھے۔

کافی اندھیرا ہو چکا تھا جب میں بل ادا کر کے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ باہر نکلا۔۔۔ شاہزان کے دروازہ پر شاہسوار خان نے ہم سے مصافحہ کیا اور ہمیں دو ماہ کے اندر اندر ملاقات کی نوید دیتا ہوا وہ صدر کی طرف کی روانہ ہو گیا اور اس دن کے بعد ہم کو اس کی شکل نظر نہیں آئی۔ نہ اس گاؤن اور چیکو رٹوپی کی شکل۔

مجھے کئی مقتدر ہستیوں کی جانب سے جن کا عالم روحانیات اور علوم پنہانی میں مطالعہ وسیع ہے اس بات کا یقین دلایا گیا ہے کہ ہمارے کرۂ ارضی کے معاملات حقیقت میں چند قطب اور ابدال چلا رہے ہیں۔ جن کا تقرر براہ راست یزدانی طاقت سے ہوتا ہے اور جو اپنے اپنے علاقوں کے روحانی انتظام کے لئے جواب دہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک قطب جو فرض کیا لاہور ڈویژن کا مختار ہے راولپنڈی ڈویژن کے قطب کی عملداری میں دخل نہیں دے سکتا اور نہ ہی اُوپر سے احکام کے بغیر اپنے علاقے سے باہر قدم رکھ سکتا ہے۔ عالم روحانیات کے طالب علم یہ کہتے ہیں کہ جیسے دنیاوی نظام میں کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس، تحصیلدار اور پٹواری وغیرہ ہوتے ہیں اور چھوٹا اپنے بڑے سے حکم لیتا ہے، ویسے ہی طاقت یزدانی کے تحت روحانی نظام میں قطب ابدال وغیرہ مقرر ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کا روحانی نظم ونسق انجام دیتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک قطب اپنے علاقے سے دوسری جگہ تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ بعض قطب ایک قسم کے انسپکٹر ہوتے ہیں جو دوسرے اقطاب کے علاقوں میں دورے کرتے ہیں اور ان کی کارکردگی کی رپورٹ اُوپر بھیجتے ہیں۔ اُوپر سے مراد محکمے افسر بالا سے ہے۔ مجھے خود میرے چچا زاد بھائی نثر حسین چنگیزی نے جو اپنے علاقے کے قطبوں اور دوسرے روحانی حکام کو نہ صرف پہچانتا ہے بلکہ ان سے اس کے تعلقات بے حد دوستانہ اور بے تکلفانہ ہیں (ایک قطب تو اس کا لنگوٹیا یار ہے) یہ بتایا ہے کہ ایک دوست قطب نے جس کو وہ اپنی موٹر میں اپنے شہر لالہ موسیٰ کے باہر ہوا خوری کے لئے گھما رہا تھا، اچانک اسے موٹر ٹھہرانے

اور واپس چلنے کی ہدایت کی اور کہا کہ اس سامنے کے درخت کے آگے میرا علاقہ ختم ہو جاتا ہے اور قطب ولی محمد کا علاقہ شروع ہوتا ہے اور مجھے اس سے آگے بغیر مناسب پروانہ راہداری کے جانے کا حکم نہیں۔

ان قطبوں کی شناخت بے حد مشکل ہوتی ہے۔ وہ بظاہر بے حد پھٹے پرانے کپڑے پہنتے ہیں اور بھیڑیں ہانکتے ہیں۔ ان کے رسل و رسائل کے طریقے ان کے اپنے ہیں اور ایک جگہ سے دو سو میل دور دوسرے شہر میں آنکھ جھپکنے میں پہنچ سکتے ہیں اگرچہ بعض دفعہ ان کو موٹر اور ریل میں سفر کرتے پایا گیا ہے۔ ریلوں کو وہ اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور کبھی ٹکٹ خرید نہیں کرتے اور ان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ مافوق الفطرت قوتیں ان سے منسوب کی جاتی ہیں اور وہ خوش قسمت جن پر ان کی نظر عنایت ہو جاتی ہے نہ کبھی اپنا مقدمہ ہارتے ہیں، نہ اپنے افسر کے کبھی مورد عتاب ہوتے ہیں اور نہ ان کو کسی محبوب کے وصال میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ..... میری ذاتی رائے میں یہ سب کچھ محض ہنس دینے کی بات نہیں، اور یہ غالباً نرا توہم نہیں۔ زمین اور آسمان کے درمیان ہزاروں ایسی ناقابل فہم اور فوق الفطرت باتیں ہیں جن کا ہماری فکر خواب بھی نہیں دیکھ سکتی (ہیملٹ نے یہ کچھ عرصہ پہلے اپنے دوست ہاریشو سے کہا تھا اور میں اس کو دوہرانے میں عیب نہیں سمجھتا کیونکہ یہ اس قدر صحیح ہے)۔

اب اس بات کا امکان ضرور ہے کہ پروفیسر شاہسوار خاں قطب تھا۔ میرا مطلب ہے تم بہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ قطب نہیں تھا! اس میں قطب کے سارے خواص اور لوازم تھے ـــ سبزی مائل آنکھوں میں جلال کی لہر، اس کا پُر اسرار طریقوں سے آنا اور جانا، اس کا لوگوں کو خدمت کا موقعہ دے کر ان کے دل کی آزمائش کرنا، اس کا دنیا کی ہر جگہ میں خواہ وہ شاہزان ریسٹوران ہی کیوں نہ ہو اپنے آپ کو ہر چیز کا بادشاہ تصور کرنا ...... بہ سرا پا ایک قطب کے لوازم تھے اور پھر ہمیں اس کی پنہاں طاقتوں کا تجربہ بھی ہوا تھا جب اس نے ہوٹل میں جن بیرے کو اس کے اصل نام سے بلایا تھا اور بیرے

نے خود اقرار کیا تھا کہ وہ یہاں کا بیرا بننے سے پہلے سلیمان شاہ صاحب کے پاس تھا۔۔۔۔اور بعض دفعہ اس کی انسانی خیالات کے بوجھ لینے کی قدرت چونکا دینے والی اور حیرت انگیز ہوتی تھی خصوصاً اس وقت جب تم اس کو پلائے پلانے پر روپے خرچ کرنے کے خیال سے بخیلانہ اور تنگ دلانہ خیالات کو اپنے دل میں جگہ دینے لگتے تھے۔۔۔۔۔ نہیں، وہ قطب تھا!

شیخ کنار تو اس بارے میں متیقن تھا اور ادب سے اب اس کا نام حضرت کے بغیر نہ لیتا تھا۔۔۔۔ پروفیسر کی طلسمی انگوٹھی کی سماوی طاقتوں میں اسے کوئی شک نہ تھا اور وہ فغفور جن کا نام ایسی محبت اور شیفتگی سے لینے لگا جیسے وہ اور فغفور اکٹھے سکول میں لنگوٹیے رہے تھے۔ اسے اب جنرل بلینوں کی کوئی ضرورت نہ تھی، نہ ہی رضیہ کے باپ قصاب کو جیتنے اور شادی پر رضامند کرنے کی اور اگر پہلے وہ میرے مشوروں پر کان دھرنے کا شائق نہ تھا تو اب ان کی مطلق ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے وہ ان سے چڑنے لگا۔۔۔۔۔
میں نے بھی، سچی بات ہے، اسے مشورہ دینا چھوڑ دیا تھا۔ میرا آخری مشورہ اس کے لئے تقریباً تباہ کن ثابت ہوا تھا اور اس تلخ تجربہ کے بعد وہ مجھ سے کوئی اور مشورے قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اگرچہ میں اپنے دوستوں کو ہر وقت مشورے دینے کو تیار رہتا ہوں (اور میرے بعض مشوروں نے لوگوں کی زندگیاں بنا دی ہیں) میں ان لوگوں کو مشورہ دینے سے احتراز کرتا ہوں جو ان کی اصابت سمجھ نہ سکیں اور ان کی قدر نہ کر سکیں۔ گدھے کو آم کھلانا بے حصول اور بے فائدہ ہے!

وہ حیرت انگیز اثر جو اس طلسمی انگوٹھی کی اس کے پاس موجودگی نے اس پر کیا، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے اسے بے حد خود اعتمادی دی، آنکھوں کے نیچے چھائیاں دُور ہونے لگیں اس کے سدا روتے پٹتے ہوئے چہرے پر بشاشت اور اُمید کی سُرخی دکھنے لگی۔ اس کی چال بھی زیادہ سیدھی اور لچکیلی ہو گئی۔ وہ گویا زندگی کی ایک نئی بہار میں داخل ہوا تھا اگرچہ ایک چیز جو مجھے اچھی نہ معلوم ہوتی وہ اس کی نئی خود مختاری اور خود سری تھی۔

مجھ سے خود سری۔ وہ ایسا محسوس کرتا تھا جیسے اسے اب میری کوئی زیادہ ضرورت نہ ہوا اور اس کا یہ جذبہ سراسر غلط تھا۔ یہ سچ تھا کہ میرے پاس اس کو دینے کے لئے اب اور قمیصیں نہ تھیں۔ وہ اب مجھے ہماری تاریخی لافانی دوستی کے حوالے بھی نہ دیتا اور مجھ سے سرسری مربیانہ انداز کا برتاؤ کرتا جیسا کہ ایک شخص جس کے پاس الہ دین کا چراغ ہوا ایک اس شخص سے کر سکتا ہے جس کے پاس الہ دین کا چراغ نہ ہو۔ پہلے دو دن تو مجھے یہ ڈر بھی رہا کہ کہیں وہ میرے ہاتھ سے نکل ہی نہ جائے مصنف بے وفا ہوتے ہیں اور میں اُسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

اس کے باوجود میں اس کی اس تبدیلی پر خوش تھا۔ وہ اس کیڑے کی طرح تھا جو تاریک گھونگھے میں سالوں مقید رہنے کے بعد اس میں سے باہر چمکتی فضائیں ل کھا کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہوا اور اس کی شکل اور صحت میں اصلاح آدمی کو باغ باغ کر تی تھی۔

مجھے یاد ہے، پروفیسر کے جانے کے تیسرے دن بعد (یہ سنیچر کا روز تھا) جب ہم کراچی کی الفنسٹن اسٹریٹ میں بورژوا زندگی کی بھڑک اور دمک دیکھتے ہوئے اسٹریٹ کے اوپر نیچے چکر لگا رہے تھے، اس نے مجھے اپنے نئے ناول کا پلاٹ بتایا جو ایک دن پہلے سے اس کے زیر تصنیف تھا۔ اس کو اتنے سال کی خشک سالی کے بعد ادبی تخلیق کی طرف لوٹ کر آتے دیکھ کر مجھے تعجب ہوا اور بے حد مسرت بھی۔ اب میں نے سوچا کٹار واقعی اپنی زندگی کے موڑ پر ہے۔ اتنے سالوں سے اس نے اپنی معاشی اور روحانی اُلجھنوں اور محرومیوں سے گھٹ کر کچھ نہیں لکھا۔ اب وہ حقیقی طور پر اپنے آپ کو خوش اور آزاد پاتا ہے جو اس نے ناول لکھنے کا سوچا ہے۔ اب یقیناً اُردو ادب شیخ قربان علی کٹار کے ایک نئے اور زیادہ پختہ نویسی کے دور سے روشناس ہو گا۔ بات یہ ہے کہ وہ اب مستقبل کا سامنا کرنے کے لئے اکیلا نہ تھا، وہ غفور جن کو ایک ناول لکھنے کے لئے کہہ سکے گا اور اس کی مدد سے اپنی (آوٹ پٹ) کو بہت زیادہ بڑھا سکے گا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی

ذہنی اور فکری طاقتیں اب عروج پر تھیں اور پچھلے چار پانچ سال کے اس کے دماغ پہ پڑے ہوئے جالے دُور ہو رہے تھے۔ اس کے نئے زیر تصنیف ناول کا پلاٹ اپنی جدت اور تفاوت میں اس کے پہلے دور کے ناولوں کے پلاٹوں سے کہیں مختلف تھا۔ اس کو اس پلاٹ کو آخر میں سلجھانے اور اس کے مختلف کھلے لٹکتے ہوئے تاگوں کو آپس میں ایک گرہ میں جوڑنے میں کچھ وقت پیش آ رہی تھی اور یہ سوچ کر کہ دو دماغ ایک سے بہر حال بہتر ہوتے ہیں۔ خواہ دوسرا میرا دماغ کتنا گھٹیا ہی کیوں نہ ہو، وہ میری مدد اور رائے کا طالب تھا۔

اس ناول میں جیسے شرلک ہومز کے ناولوں کی طرح خالص جاسوسی "کس نے۔کیا؟" قسم کا ناول ہونا تھا اور رَبط ضَبط جس میں ایک ضمنی معاملہ کے طور پر ناول کو ذرا چاشنی دینے کے لئے آئی تھی، سب سے بڑی دقت جو اس کے خالق شیخ قربان علی کتار کو پیش آ رہی تھی اسی نوعیت کی تھی جو سب دوسرے "کس نے۔کیا؟" والے ناول نگاروں کو پیش آتی تھی ـــ یہ ناول مختصراً پراسرار ڈاکو ولیا کی انسانیت کشی اور قاتلانہ کارروائیوں سے متعلق تھا جو دن دہاڑے، ڈنکے کی چوٹ اور پولیس کو جگہ اور وقت کی اطلاع دے کر اپنی خوف ناک کارروائیاں کرتا اور غائب ہو جاتا تھا اور پولیس کھڑی حیران دیکھتی رہ جاتی تھی۔ پولیس کا ہونہار انسپکٹر شہباز خاں جیسا کہ ہر ایک کو علم ہے، شرلاک ہومز کا کلاس فیلو ہے۔ اور اس نے بڑی بڑی وارداتوں کے خرانٹ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے۔ انسپکٹر شہباز خود ولیا کی چالاکیوں کے سامنے عاجز آ جاتا ہے اور اسے پتہ نہیں چلتا کہ ولیا یہ سب کچھ کرتا کیسے ہے؟ ایک دفعہ ولیے نے اپنے مظلوم کو قتل کرنے سے پہلے اور اس کی تجوری لوٹنے سے پہلے انسپکٹر شہباز خاں کو خط کے ذریعہ ہونے والی واردات اور اس کے ٹھیک وقت سے اطلاعاً مطلع کیا۔ شہباز خاں نے اس دفعہ قاتل کو کوئی موقعہ نہ دینے کی خاطر اپنے آپ کو امیدوار مقتول کے ساتھ اس کے بنگلے کے ایک کمرہ میں مقفل کر دیا جس کے روشندان تک نہ تھے۔ انسپکٹر شہباز خاں کے دونوں ہاتھوں میں دو ہری

احتیاط کی خاطر دو بھرے ہوئے پستول تھے۔ ویلیے نے ٹھیک سات بجے اپنے مظلوم کو اگلے جہاں بھیج دینے کا وعدہ کیا تھا اور انسپکٹر شہباز خاں اور ہونے والا مظلوم وہ کوئی سیٹھ وغیرہ تھا، انتظار اور اضطراب میں دیوار پہ لٹکے ہوئے کلاک کی سوئیوں کی طرف دیکھ رہے تھے جو مقررہ وقت کی طرف تیقن سے رینگتی جا رہی تھیں۔ انسپکٹر خاں نے کوٹھی کے چاروں طرف بھی پولیس کھڑی کر رکھی تھی اور اس نے اپنے آدمیوں سے دعویٰ کیا تھا کہ اب کے ویلیا اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے گا۔ آہستہ آہستہ۔ بڑی سوئی آگے رینگ رہی ہے۔ پنڈولم سیکنڈوں کو شمار کرتا ہل رہا ہے۔ اب سات میں چار منٹ ہیں۔ دو منٹ۔ ایک منٹ آدھ منٹ اور اب بڑی سوئی بارہ کو چھوا ہی چاہتی ہے۔ پنڈولم ہل رہا ہے۔

"ڈزا، ڈزا،" کوٹھی کے باہر تعینات شدہ پولیس مین فائروں کی آواز سنتے ہیں اور وہ دوڑ کر اس کمرے کی طرف بھاگتے ہیں جس میں ہونے والا مظلوم اور انسپکٹر شہباز خاں مقفل ہیں۔ وہ قفل کھول کر جس کی چابی ہیڈ کانسٹیبل کے پاس ہے کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ کمرے میں دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا ہے اور جب دھواں صاف ہوتا ہے ان کو انسپکٹر شہباز خاں کی شکل ہاتھ میں پستول لئے نظر آتی ہے اور اس کے نیچے فرش پہ ہونے والا مقتول دوہرا ہوا ایک خون کے جوہڑ میں پڑا ہے۔ سامنے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اور شہباز خاں چلا چلا کر کہہ رہا ہے" وہ نابکار وہاں سے بھاگا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل اس کا تعاقب کرو۔۔۔۔۔۔ اس نے پہلے ہی اپنے آپ کو نزور اس کمرہ میں چارپائی کے نیچے چھپا رکھا تھا"۔۔۔۔۔

" اب چنگیز ہی یار،" کتار نے کہا میری دقت یہ ہے کہ ویلیے کے پولیس کی موجودگی میں ان قتلوں کو کر کے فرار ہو جانے کی کوئی تسلی بخش توجیہہ ہونی چاہیئے جو پڑھنے والے کے دل کو لگے۔ ذرا سوچو۔ اگر تم ویلیا ہوتے تو تم یہ سب کچھ کیسے دن دہاڑے قانون کی نگاہوں کے سامنے کرتے اور سب کی آنکھوں میں دھواں ڈال کر صاف بچ کر نکل بھی جاتے۔"

"ڈھول ڈال کر،" میں نے جواب دیا۔

"چنگیزی یار! مذاق نہ کرو۔ اگر اس کی تسلی بخش توجیہہ مل جائے تو یہ ناول ایک "شمشیر" ہو سکتا ہے۔ غالباً اردو ادب کا بہترین سنسنی خیز جاسوسی ناول۔"

مجھے ایک خیال سوجھا جو میری رائے میں بے حد چمکیلا تھا۔

"کٹار۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ آخیر میں یہ دکھا دو کہ ویلا دراصل خود انسپکٹر شہباز خاں تھا۔ تم جانتے ہو۔ انسپکٹر شہباز خان خود ہی ویلے کے خط لکھتا تھا اور چونکہ وہ موقعہ واردات پر ہمیشہ خود موجود ہوتا تھا اور اکثر دفعہ وہی ایک شخص ہوتا تھا جو ہونے والے مقتول کے ساتھ ہوتا تھا، اس کے لئے یہ کرنا بالکل آسان تھا اور پھر انسپکٹر ہونے کی وجہ سے اور کوئی اس پر شک نہیں کر سکتا۔"

"خدا کی قسم،" کٹار چلایا۔ "اقبال حسین چنگیزی! تم ایک جینیس ہو!" اور پھر اچانک یہ خیال کر کے کہ اس نے میری ضرورت سے زیادہ تعریف کر دی ہو اس نے جلدی سے کہا "یہ تو مجھے بھی خیال آیا تھا مگر انسپکٹر شہباز خاں کو میں ہیرو بنانا چاہتا ہوں اور اسے اصل قاتل بتانے سے انسپکٹر کا پچھلا ریکارڈ خراب ہو جائے گا۔ اپنے پہلے ناولوں میں میں نے اسے ایک ایماندار، مستعد اور دلیر افسر دکھایا ہے۔ اس ناول میں میں اس کی شادی کرانا چاہتا ہوں۔"

"پھر صرف ایک ہی ممکن صورت ہے،" میں نے کہا "اور وہ یہ کہ ویلے کے پاس طلسمی انگوٹھی ہو اور وہ یہ قتل ققنوس جن کے ہاتھوں سے کرائے۔ جو پولیس کو نظر نہیں آ سکتا اور جن ہونے کی وجہ سے دیواروں میں سے گزر سکتا ہے۔"

"یہ تشریح بھی اچھی ہے۔ اچھی ہے!" اس نے میری زیادہ تعریف کرنا ضروری نہ سمجھی مگر اس کے مطمئن انداز سے مترشح تھا کہ یہ اس کے دل کو بھا گئی ہے اور یہی حل وہ اپنے موقر ناظرین کو پیش کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔

میرے یہ سب کچھ لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کٹار کی تخلیقی صلاحیتیں پھر بیدار ہو رہی تھیں۔
اور تین چار سال کے بعد پھر امنگوں اور خیالات سے معمور ہو رہا تھا اور اس کی انگلیاں لکھنے
کے لئے بے تاب ہو رہی تھیں۔۔۔ میں پڑھنے والے کو بتا دوں کہ وہ شالوں پر قربان علی
کٹار کے اس معرکتہ الآرا جاسوسی ناول کو جو اُوپر زیر بحث رہا ہے بے فائدہ ڈھونڈے گا
قربان علی کٹار نے یہ ناول بتیس صفحات سے زیادہ لکھا ہی نہیں اور اس نے اسے ختم نہیں
کیا۔ اب اس کے ختم ہونے کی امید بھی نہیں۔۔۔ کیونکہ میرے پیارے پڑھنے والے! یہ شیخ
قربان علی کی زندگی کی بہار (افسوس! صد افسوس!) چند روزہ تھی۔ اس کے دل کا کنول کھلتے
ہی مرجھانے لگا۔ اور۔۔۔۔

میں جب سے چاکی واڑا کا مقیم ہوا ہوں بوڑھے پیپس کی طرح اپنا ایک روزنامچہ رکھتا ہوں، جس میں میں ہر روز ان واقعات، اشخاص اور دوسری اہم اور غیر اہم باتوں کا اندراج کرتا ہوں جن کا کبھی نہ کسی طرح میری ذات سے تعلق ہوتا ہے۔ میرا روزنامچہ ایک طرح چاکی واڑا کا ایک بے سرو پا لمبا کرانیکل ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس شہر کا مستقبل کا مؤرخ یا ناول نویس اس میں بہت سی ایسی باتیں پائے گا جو اس کے لئے کارآمد ہوں گی ـــــ اس میں میرے واقف کاروں، دوستوں اور جمع کئے ہوئے مصنفوں اور دوسرے عجیب و غریب کرداروں کے مکمل اور مفصل قلمی خاکے ہیں اور میں نے بعض جگہ ان کی پوری پوری طویل گفتگو نقل کر رکھی ہے جیسے وہ گفتگوئیں بے حد ضروری ہوں اور ان کو کہنے والے بڑے کیبنٹ منسٹر یا عظیم فلسفی ہوں جن کے ایک ایک لفظ کو محفوظ کرنا آنے والی نسلوں اور دنیا کے مستقبل کے لئے شدید اہمیت کا معاملہ ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ میں بہت سے آدمیوں کے لئے ایک وباسویل ہوں۔ اور یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ لوگ ہی چاکی واڑا ہیں میں ایک خاضرہ نویس کی حیثیت سے اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ وہ اور ان کے کردار میرے کرانیکل کے صفحات میں جیتے جاگتے ہوئے پھریں . . . شیخ قربان علی کٹار کی اس غمناک کہانی کو لکھتے وقت میرا روزنامچہ میرے سامنے رہا ہے اور میں بہت سی گفتگوئیں اور واقعات اسی کے حوالے سے یہاں نقل کر سکا ہوں مجھے ڈر ہے میں نے اپنے مواد میں حسنِ انتخاب نہیں دکھایا مگر

میں عرض کروں گا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اب روزنامچہ پر نظر ڈالتے ہوئے میں دیکھتا ہوں کہ اگر میں اگلے بارہ دنوں کی شیخ قربان علی کٹار کی پوری روئداد رقم کروں (یعنی ہماری گفتگوئیں، بحثیں، کٹار کے وسوسے اور خدشات)، تو اس کے لئے بذاتِ خود ایک مکمل جلد کی ضرورت ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ میرا مہربان پڑھنے والا، اپنی ساری مہربانی کے باوجود ان صبر آزما تفصیلات کا متحمل ہو سکے گا (یعنی اگر وہ اب تک اس بیان سے اُکتا کر اسے پھینک نہیں چکا اور اقبال حسین چنگیزی اور شیخ قربان علی کٹار دونوں پر لعنت نہیں بھیج چکا)

اس لئے میں اگلے دس بارہ دن کے حالات مُجملاً رقم کر دوں گا۔ شیخ قربان علی نے اسی رات سے جب سے پروفیسر شاہسوار خاں نے اسے طلسمی انگوٹھی بیچی تھی، اس پر وہ مشق شروع کر دی تھی جس کے بعد وہ اس قابل ہو سکتا تھا کہ اس پر عمل کر سکے اور نگینے میں سے گھاس کا میدان اور نغفور وغیرہ کو دیکھ سکے۔ دو تین بار اس کے فلیٹ پر جب میں شام کو اس سے ملنے کے لئے جاتا تو مجھے دروازہ کے باہر دس پندرہ منٹ تک انتظار کرنا پڑتا۔ جب اس کے بعد قربان علی کٹار آنکھوں میں ایک مقدس سی نگاہ لئے دروازہ کھولتا تو وہ معذرت کرتا کہ وہ انگوٹھی کے ساتھ اپنی ریاضت میں مشغول تھا اور اس کو بیچ میں چھوڑ کر میرے لئے دروازہ نہیں کھول سکتا تھا جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے۔

پہلے پہل یہ طلسمی انگوٹھی اسے ایک نیا آدمی بناتی معلوم ہوتی تھی اور وہ نتیجہ کے متعلق بالکل پُر یقین اور پُر امید تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس پر پروفیسر شاہسوار خاں کی خاص نظر ہے اور یہ کہ پروفیسر اس کا کبھی ساتھ نہ چھوڑے گا۔ اپنی مشقوں کے درست اور ہدایات کے مطابق ہونے میں اسے کچھ شکوک تھے، اسے یہ پورا یقین نہ تھا کہ آیا پروفیسر کی یہ ہدایت کہ انگوٹھی کے نگینے میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھا جائے، یہ مطلب

بھی تھا کہ اس اثنا میں آنکھ نہ جھپکی جائے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تین منٹ تک آنکھ کو جھپکنے سے روک سکتا تھا اور اس کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ پروفیسر کی ایک دوسری ہدایت کی صحیح پابندی بھی مشکوک تھی۔ پروفیسر نے کہا تھا کہ انگوٹھی پر مشق کے بعد دل میں اور دماغ میں ایک خلا ہونا چاہیئے اور اگر کوئی خیالات ہوں تو وہ اچھے اور پاک ہوں۔ قربان علی کٹار نے مجھے بتایا کہ بعض وقت اسے انگوٹھی پر مشق کے وقت ایسے خیالات آتے تھے جنہیں شاید نیک اور پاک نہ کہا جا سکے۔ اس نے مجھے یہ نہ بتایا کہ وہ خیالات کیا تھے، صرف یہی کہا کہ وہ پاک اور نیک نہ تھے اور میرا قیاس ہے وہ محبوبہ کے متعلق چند ایسے تصورات تھے جنہیں عام طور پر اخلاقیات کی رو سے فحش کہا جاتا ہے۔ میں قربان علی کٹار کی ڈھارس بندھاتا کہ محبوب کے متعلق کتنا ہی غیر اخلاقی تخیل ہو۔ وہ پاک اور معصوم ہوتا ہے، خصوصاً اگر محبوب خود پاک اور نیک ہو، برف اور دودھ کی طرح پاک مگر فرائیڈ کو نہ پڑھے ہوئے ہونے کی وجہ سے قربان علی کٹار میں گناہ کا احساس بے حد شدید تھا۔

مشق میں ان کوتاہیوں نے شیخ قربان علی کو زیادہ پریشان نہیں کیا، اسے پروفیسر شاہسوار خاں کے پدرانہ سہارے پر یہ اعتماد تھا وہ ان چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کے باوجود اس کو منزلِ مقصود پر پہنچائے گا۔۔۔۔۔۔

میرا خیال ہے کنّار کو انگوٹھی پر مشق کرنے کا ساتواں دن تھا کہ میں نے اس کی فلیٹ پر جا کر اسے ایک بالکل متغیر شخص پایا۔ اس شام ایک بے حد سہمے ہوئے دبلا نے سے آدمی نے میرے لئے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ اس کے چہرے پر ایک مردے کی نظر تھی جس سے ابھی ابھی کراما لکاتبین نے ملاقات کی ہو اور اسے دوزخ کی خوشخبری دی ہو۔ ایک لمحہ کے لئے میں تیورا سا گیا اور میرا پہلا تاثر تھا کہ یہ کنّار کے سوا کوئی اور شخص ہے۔ دراصل میں ان پچھلے سات دنوں میں ایک پُر امید مسرور، سیٹیاں بجانے والے گرم سینمائی راگ گنگنانے والے، کنّار کا عادی ہو چلا تھا۔ اور اس آسیبی صورت کے لئے جو مجھے یک لخت اس شام نظر آئی، میرا دماغ تیار نہ تھا۔ وہ بمشکل ایک آدمی کی صورت کہی جا سکتی تھی۔ متوحش آنکھیں۔ زرد بچڑا ہوا چہرہ، بال اٹے ہوئے پریشان...... اور ایک عجیب سی کٹ۔ کٹ۔ کٹ کی قسم کی آواز میں نے سُنی۔ اس کے دانت بج رہے تھے۔

"کیا بات ہے کنّار! خیریت تو ہے!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ انسانی ہمدردی کے لمس کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اور اس نے میرے ہاتھوں کو اپنے کندھوں سے جھٹک دیا۔

وہ کمرے کے کونوں کھدروں میں متوحش نظریں ڈال رہا تھا اور ایک دفعہ میں نے اسے جھک کر چارپائی کے نیچے جھانکتے ہوئے پایا۔

" چلا گیا ہے " اس نے لکنت آمیز زبان میں اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔
" کون چلا گیا ہے۔ کنار! " میں نے پوچھا " یہاں تمہارے پاس کون تھا " ؟ میں واقعی اس کے بارے میں اب ڈرنے لگا تھا۔

" فغفور جن! " اس نے جواب دیا " تمہارے آنے سے پہلے وہ یہاں اس کمرے میں تھا۔ یہاں بالکل میری کرسی کے پاس کھڑا ہوا۔"

میں نے سوچا کہ اس کے اعصاب جواب دینے لگے ہیں اور یہ کہ وہ آسیب دیکھنے لگا ہے......

" فغفور "، میں نے کہا۔ مگر اس کو تو صرف انگوٹھی کے نگینے میں آنا چاہیئے تھا کمرہ میں آنے کا اس کا کوئی مطلب نہیں۔ اور ابھی تو تم کو انگوٹھی پر عمل کرنے کا ساتواں دن ہی ہے "۔۔۔

ہم کھلے ہوئے دروازہ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ میرے آنے سے کنار کی حالت کچھ سنبھل گئی تھی اور خون اس کے پچکے ہوئے گالوں میں لوٹ آیا تھا۔ پھر بھی اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اور دانتوں کی کٹکٹاہٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس خوف کے دورے نے اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا تھا۔

میں نے اسے اپنے جیب میں سے نکال کر ایک سگرٹ پیش کیا جو واضح کرتا ہے کہ اس کی حالت کتنی دگرگوں ہو گی اور کتنی ترحم انگیز کیونکہ جہاں تک کنار کا تعلق ہے۔ میں نے سگرٹ پیش کرنے کی عادت کو عرصے سے چھوڑ رکھا ہے۔ اس نے اپنی کپکپاتی پتلی انگلیوں میں سگرٹ کو پکڑ کر دھواں اڑاتے ہوتے کہا اور اس عمل سے اس کی جرأت اور حوصلہ واپس آتے معلوم ہوتے تھے۔

" ہاں چنگیزی میاں! " وہ بولا " آج جب میں انگوٹھی پر عمل کر چکا تو میری نگاہ کرسی کے نیچے پڑی۔ تم یقین نہیں کرو گے۔ کہ میرے پاؤں کے پاس ایک چھوٹا سا جن

کھڑا تھا ــــــ دو فٹ اُونچا جن اور بالکل ایسا ہی جیسا کہ پروفیسر شاہسوار خاں نے فغفور جن کا حلیہ بیان کیا تھا اس کی آنکھیں اسی طرح کھڑی ہوئی تھیں اور ایک چھوٹی سی بوجڑانہ ڈاڑھی تھی۔ تم جانتے ہو میں فغفور کو اس طرح اور اس صورت میں اپنے کمرے میں دیکھنے کی توقع نہیں کرتا تھا اور اس کا یہاں ہونا میرے لئے حیرت خیز تھا اس کا طرزِ عمل دوستانہ تھا اور وہ میری طرف دیکھ کر کچھ احمقانہ طریق پر مسکرا رہا تھا مگر مجھے خوف اور دہشت نے جکڑ لیا اور میرے جسم سے پسینہ چھوٹ پڑا۔ میں نے اپنی کمر سیوں کے بازوؤں کو زور سے بھینچ لیا اور چلانا چاہتا تھا مگر میرے گلے میں آواز نہ رہی تھی۔ میں مانتا ہوں چنگیزی! کہ میرے لئے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ خیر اتنے میں فغفور مڑا اور مجھے مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوا اور اسی طرح مسکراتا، آہستہ آہستہ اس چارپائی کے نیچے چلا گیا۔"

"یہ تمہارے تخیل اور وہم کی پیداوار ہے۔" میں نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے، پروفیسر شاہسوار خاں نے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ فغفور انگوٹھی کے نگینے میں آئے گا یا فرض کرو وہ واقعی جن ہی تھا تو اس کا مسکرانا اور دوستانہ انداز ہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک معصوم اور بے ضرر جن ہے مجھے یقین ہے کہ فغفور، اگر یہ فغفور ہی تھا۔ ایک یار باش اور سوشل جن ہے اور تمہارے کمرے میں اس طرح اس کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ تمہیں ذاتی طور پر دوست بنانے کا خواہاں ہے۔ ممکن ہے وہ بنفس نفیس تم سے احکام لینے آیا ہو۔ تمہارے اس بے جا ہراس سے اسے بے حد پریشانی اور شرمندگی ہوئی ہوگی ...... ویسے کٹار! ایک ایسے دوست کی حیثیت سے جس کو تمہاری بہبودی اور خوشی عزیز ہے تم کو ان جنّات کا اب عادی ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ جب پندرہ دنوں کی مشق کے بعد تم انگوٹھی پہ اپنا عمل کرو گے تو تمہارا واسطہ غالباً جنوں کے ایک پورے لشکر سے ہوگا۔"

"مگر فغفور کو اس طرح کمرے میں گھس آنے کا کوئی اختیار نہ تھا،" کٹار نے شکایت کی۔

"اگر وہ اور اس کے ساتھی نگینے میں رونما ہوتے تو میں اس کو ان کی شرافت پہ محمول کرتا۔"

"خیر،" میں نے کہا "تمہارے اس شورہ پشت کر دینے والے طریق عمل کے بعد بھی اگر فغفور یہاں گھس آئے، اگرچہ میں کوئی زیادہ پر اُمید نہیں، تو اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اس کو چمکارو۔ اس سے باتیں کرو خیریت پوچھو اور یہ پوچھو کہ سلیمان شاہ کا آج کل شغل کیا ہے میرا مطلب ہے اِدھر اُدھر کی چھوٹی موٹی باتیں جن سے فغفور کو معلوم ہو جائے کہ تم واقعی اس کو پسند کرتے ہو۔ یہ فغفور، تمہاری کہانی کے مطابق مجھے ایک مشکور کرنے والا شخص یا جن معلوم ہوتا ہے اور وہ تمہارے لئے بے اندازہ مفید ہو سکتا ہے۔ وہ رضیہ تک تمہارے پیغام لے جا سکتا ہے، اللہ توکل بیکری سے تمہارا کھانا یہاں فلیٹ تک لا سکتا ہے اور اگر وہ ادبی ذوق رکھتا ہے تو تمہاری بجائے تمہارے نئے ناول یہ کام کرنے کے لئے اُسے کہا جا سکتا ہے"۔ . . .

"میں نہیں جانتا،" کنار نے کہا "کہ تم سنجیدگی سے یہ کہہ رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو۔ . . . مگر چنگیزی یار! میری تم سے استدعا ہے کہ تم آج رات یہیں فلیٹ پر سوؤ۔ ممکن ہے تمہارے جانے کے بعد فغفور پھر ــــ"

اب مجھے پتہ لگا کہ اس کا خوف اس کے دل میں جانشین ہو چکا ہے اور اس کے لئے حقیقی ہے۔ وہ یہ یقین کرتا تھا کہ فغفور کسی وجہ سے مجھ سے ڈرتا ہے اور کتراتا ہے۔ اور میری موجودگی میں فلیٹ پہ نہیں آئے گا۔ مگر سچی دوستی کے باوجود رات کنار کے فلیٹ میں گزارنا بلکہ شاید اس کے بستر میں اس کے ساتھ سونا میرے لئے خوش آئند نہ تھا . . . . . . اور پھر ایک رات کی بات نہ تھی! فغفور کو دُور رکھنے کے لئے مجھے کئی آنے والی راتیں اس فلیٹ میں گزارنی ہوں گی اور اس صورت میں جب کہ فغفور بھی ارد گرد پاس ہی ہوگا . . . . . .

اچانک میری نظر مسافر کے ادنیٰ جسم پہ پڑی جو ایک آنکھ میچ کر اور اپنی گلابی زبان

"اگر وہ اور اس کے ساتھی نگینے میں رونما ہوتے تو میں اس کو ان کی شرافت پہ محمول کرتا۔"

"خیر،" میں نے کہا "تمہارے اس شورہ پشت کر دینے والے طریق عمل کے بعد بھی اگر فغفور یہاں گھس آئے، اگرچہ میں کوئی زیادہ پر اُمید نہیں، تو اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اس کو چمکا رو، اس سے باتیں کرو خیریت پوچھو اور یہ پوچھو کہ سلیمان شاہ کا آج کل شغل کیا ہے میرا مطلب ہے ادھر اُدھر کی چھوٹی موٹی باتیں جن سے فغفور کو معلوم ہو جائے کہ تم واقعی اس کو پسند کرتے ہو۔ یہ فغفور، تمہاری کہانی کے مطابق مجھے ایک مشکور کرنے والا شخص یا جن معلوم ہوتا ہے اور وہ تمہارے لئے بے اندازہ مفید ہو سکتا ہے۔ وہ رضیہ تک تمہارے پیغام لے جا سکتا ہے، اللہ توکل بیکری سے تمہارا کھانا یہاں فلیٹ تک لا سکتا ہے اور اگر وہ ادبی ذوق رکھتا ہے تو تمہاری بجائے تمہارے نئے ناول پہ کام کرنے کے لئے اُسے کہا جا سکتا ہے"۔ . . .

"میں نہیں جانتا،" کٹار نے کہا "کہ تم سنجیدگی سے یہ کہہ رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو۔ . . . مگر چنگیزی یار! میری تم سے استدعا ہے کہ تم آج رات یہیں فلیٹ پر سوؤ۔ ممکن ہے تمہارے جانے کے بعد فغفور پھر ـــ"

اب مجھے پتہ لگا کہ اس کا خوف اس کے دل میں جانشین ہو چکا ہے اور اس کے لئے حقیقی ہے۔ وہ یہ یقین کرتا تھا کہ فغفور کسی وجہ سے مجھ سے ڈرتا ہے اور کتراتا ہے۔ اور میری موجودگی میں فلیٹ پہ نہیں آئے گا۔ مگر سچی دوستی کے باوجود رات کٹار کے فلیٹ میں گزارنا بلکہ شاید اس کے بستر میں اس کے ساتھ سونا میرے لئے خوش آئند نہ تھا . . . . . . اور پھر ایک رات کی بات نہ تھی! فغفور کو دُور رکھنے کے لئے مجھے کئی آنے والی راتیں اس فلیٹ میں گزارنی ہوں گی اور اس صورت میں جب کہ فغفور بھی ارد گرد پاس ہی ہوگا . . . . . .

اچانک میری نظر مسافر کے ادنیٰ جسم پہ پڑی جو ایک آنکھ میچ کر اور اپنی گلابی زبان

باہر نکال کر مجھے ایک مسخرے کے انداز سے دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو پتہ نہ چلا کہ مسافر اُوپر کس وقت آیا تھا۔ یہ مسافر کی کرامت تھی! وہ پراسرار طریق سے آتا اور چلا جاتا اور بعض وقت جب تم اچانک دیکھتے تو وہ سامنے تمہارے پاؤں کے پاس بیٹھا ہوا تمہیں ایک مضحک انداز سے دیکھتا ہوا بیٹھا ہوتا حالانکہ ایک لمحہ پہلے جب تم نے اس طرف دیکھا تھا تو تم نے اس طرف دیکھا تھا تو تم یقین سے کہہ سکتے تھے کہ وہ وہاں نہ تھا۔

اس کو دیکھ کر میرے دل میں یکایک ایک خیال آیا۔

"واہ بھئی کٹارا!" میں نے کہا، "میرے یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے یہ ہمارا مسافر جو ہے تم جانتے ہو جنات کو کتوں سے نفرت ہوتی ہے جہاں کتے ہوں وہاں جنات قدم نہیں دھرتے میں نے خود تسخیر جنات، مصنفہ پروفیسر جی۔پی۔کتوری میں پڑھا ہے جو اس موضوع پر مستند ٹیکسٹ بک ہے۔ میرا خیال ہے تم مسافر کو ہمیشہ اپنے فلیٹ میں رکھا کرو بلکہ اس کو ساتھ سلایا کرو۔ اسے ایک آقا کی ضرورت ہے۔"

لمبے کانوں والے اونی مسافر کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجھ سے اتفاق ہے اور شیخ قربان علی کٹارکے بھی میری بات دل کو لگی عموماً وہ میری ان باتوں پر جن کے ساتھ کوئی معتبر سند نہ ہو کان نہیں دیا کرتا تھا مگر میرے اس بیان کے ساتھ جی۔پی۔کتوری کی سند تھی جس سے بہتر ماہر جنات اس ملک میں بھی چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے نہیں مل سکتا۔

اسی طرح باتیں کرتے ہم وہاں دیر تک بیٹھے رہے۔ رضیہ اس عرصہ میں سامنے اپنی بالکنی پر نہ آئی اور نہ ہی اس کا بالکنی کے رُخ کا دروازہ کھلا۔ (صرف ایک دفعہ وہ تھوڑا سا کھلا۔ ٹاٹوں کے پیچھے سے روشنی کی ایک لمبی سی عمودی لکیر اور اندر سے کسی عجیب حیوان کی غراہٹوں اور خرخراہٹوں کی قسم کی آوازآئی مگر فوراً ہی وہ روشنی کی لمبی لکیر تاریکی میں مٹ گئی) پچھلے دو دنوں سے میں نے اسے بالکنی پر نہیں دیکھا تھا اور تعجب کررہا تھا کہ وہ کہاں ہے (خود میری زندگی سے ایک شمع گویا گُل ہو گئی تھی......) تھوڑی دیر تک میں اور

قربان علی کتار عجیب عزغزا ہٹاں کی ہیئت پر بحث کرتے رہے کہ وہ کیا ہو سکتی ہیں۔ کیا قصاب نے اپنے کمرے میں لاتعداد بلیاں بند رکھی ہیں اور وہ آپس میں لڑ رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یہ مطلق نہ سوجھا کہ ان آوازوں کا خالق خود قصاب ہو سکتا ہے۔

میں نے کتار کو کوئی گیارہ بجے چھوڑا مسافر کو اس نے اُٹھا کر گود میں بٹھا رکھا تھا اور میں نے کتار کو جاتے ہوئے کہا کہ اگر میرے فلیٹ سے قدم باہر رکھنے پر پھر مسافر کے باوجود بھی فغفور آ جاتے، تو وہ مجھے اُوپر کھڑکی میں سے نیچے گلی میں سے آواز دے سکتا ہے۔ گلی میں سے جاتے ہوئے کتار کی آواز نہ آئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اب مخمورا ہے اور فغفور مسافر سے بھی اتنا ہی خائف ہے جتنا کہ مجھ سے۔

اس سے اگلے تین دن میں شیخ قربان علی کٹار کو فغفور صرف ایک دو بار اپنے پاؤں کے پاس کھڑا ہوا نظر پڑا ـــــ اور وہ بھی اس وقت جب مسافر اس کے پاس سے کہیں نیچے گلی میں سیر سپاٹے کے لئے گیا ہوا تھا۔ مگر ان ملاقاتوں نے بھی اسے اس کے دل سے اس ظاہرا اصیل اور سوشل جن کے خوف کو نہ دور کیا۔ کٹار ان دنوں شاذونادر ہی باہر جاتا اور ایک طرح عزلت پسند سا ہو گیا.... میں نے دیکھا کہ مسافر کی قربت کے باوجود اس کی آنکھیں اندر کو دھنستی جا رہی ہیں۔ بعض وقت اس کی آنکھوں میں ایک پُر جلال دیوانگی اور وحشت سی ناچتی اور ان کی سُرخی ظاہر کرتی کہ وہ رات بھر بدخوابی کا شکار رہا ہے۔ مصیبت یہ تھی کہ اس کو یہ پتہ نہ تھا کہ کونسے وقت فغفور آ جائے گا اور ان تین دنوں میں رضیہ بھی بالکنی پر نظر نہ آئی ـــ شیخ قربان علی کٹار کا رُوحانی بیرومیٹر بڑا اُنچا گر گیا تھا اور میں متفکر رہنے لگا۔

ایک دفعہ تو فغفور جن نے میری موجودگی کو بھی نظر انداز کر دیا۔ سنیچر کی شام کو میں شیخ قربان علی کٹار کو بصد وقت "اکسا کر" تبدیلی کی خاطر الفنسٹن اسٹریٹ میں لے گیا کہ شاید وہاں کی گہما گہمی، بھڑک دمک اور چمکتی ہوئی موٹر کاروں سے اس کا دل کچھ بہل جائے۔ الفنسٹن اسٹریٹ عام طور پر شیخ قربان علی کٹار کی بھنچی ہوئی رُوح کو کچھ مسرور کر دیتی ہے کیمونسٹ نہ ہونے کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں کی موٹر کاروں کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی بیویاں اور لڑکیاں بھی اس میں مناسب احساسات پیدا کرتی

ہیں۔ اس شام ہم نے الفنسٹن اسٹریٹ کے چار پانچ چکر لگائے اور وہ اسی طرح اُداس اور پٹا ہوا تھا، اور ایک جگہ جس مزاح کی حس کا اظہار اس نے کیا وہ میری سمجھ میں مطلق نہ آئی۔ پیرے ڈائز کی طرف گلی میں سے گزرتے ہوئے اس نے مجھے کھڑا کر لیا اور مجھے بلند آواز سے سامنے دیوار پر کوئلے سے لکھے ہوئے چند حروف پڑھنے کے لئے کہا۔ میں نے بغیر کسی شک و شبہ کے ایک معمول کے لہجہ میں انہیں پڑھنا شروع کیا۔ "میں اُلو ہوں! میں گدھا ہوں، میں سو فیصدی گدھا ہوں۔"

"چنگیزی!" شیخ قربان علی کٹار نے کہا "میرا یہ خیال نہ تھا۔ مگر کیونکہ تم خود اس کا اقرار کرتے ہو، میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم سو فیصدی گدھے ہو۔"

کتنی عجیب اور بے ہودہ سی مزاح کی حس!

وکٹوریہ روڈ پر پیرے ڈائز سے کافی ہاؤس جاتے وقت سامنے سے مجھے مشہور ترقی پسند ادیب رزم حنائی آتا ہوا نظر پڑا۔ رزم حنائی ترقی پسندوں کے پالیٹ بیورو کے پہلے پانچ میں سے ہے اور واحد ایسا ترقی پسند ہے جس نے اپنے اعتقادات اور ادبی مسلک کے رنگ سے اپنے جسم اور لباس تک کو بچ کر نہیں رہنے دیا، اس کے سر کے اور مونچھوں کے بال مہندی سے رنگے ہوئے سُرخ ہیں، اس کا چہرہ قدرتی سُرخ ہے۔ اور اس کے ترقی پسند ہونے کے بعد سے اور سُرخ ہو گیا ہے۔ وہ سُرخ رنگ کا سوٹ پہنتا ہے۔ اس کے بوٹ براؤن ہوتے ہیں۔ وہ ان معدودے چند آدمیوں میں سے ہے۔ جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنا دل اپنی آستین پر پہنے پھرتے ہیں اور جن کا اندر اور باہر ایک ہوتا ہے۔ رزم حنائی اس کا اصل نام نہیں، یہ نام اس نے پچھلے سال ترقی پسند ہونے پر اختیار کیا، اس کا اصل نام بے حد عام اور اصیل سا ہے — میاں چراغ دین چیمہ۔ پچھلے سال وہ خود اپنے قول کے مطابق رجعت پسند تھا۔ مگر خواہ وہ رجعت پسند تھا یا ترقی پسند، اس وقت کوئی اس کی زیادہ پرواہ نہ کرتا تھا اور اگرچہ اس کی بعض تنقیدیں اور مختصر کہانیاں

رسالوں میں چھپتی رہتی تھیں، رسالوں کے ایڈیٹر اس کے جینیس کے قائل نہ ہوئے تھے پچھلے سال بہت کم لوگوں نے اس کا نام سُنا تھا...... اور پھر اس نے دیکھا کہ اچھے رسالوں کے ایڈیٹروں نے اس کی چیزوں کو واپس بھیجنا شروع کر دیا۔ بعض ایسے رسالے اب بھی تھے۔ مثلاً چودھری معراج دین کا ''شاہین'' اور مولانا محمد خاں کا ''خیالِ فرتوت''، جو اس کی چیزوں کو اب بھی بصد تشکر چھاپنے کو تیار تھے اور خصوصاً مولانا محمد خاں اپنے تعارف نامہ میں اس کی ہمیشہ بے حد تعریف کرتا اور اپنے مربیوں کو بتاتا کہ چراغ دین چیمہ سے اردو ادب کی بے حد توقعات وابستہ ہیں۔

''بادش بخیر!'' وہ لکھتا ''لیجئے اب کے پھر میاں چراغ دین چیمہ ہماری بزمِ ادب میں رونق افروز ہیں۔ اب کے انہوں نے جو افسانہ بھیجا ہے وہ ایسا شاہکار ہے کہ بڑے بڑے اُستادان کی ڈیوڑھی پہ آکر جھاڑو دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک افسانہ تمام پچھلے یک سالہ اُردو افسانوں پر بھاری ہے۔''

اگر مولانا محمد خاں کی تعریف کے کوئی معنی نہ تھے۔ وہ ہر ایک کی تعریف کرتا تھا اور جو کچھ ''خیالِ فرتوت'' میں چھاپا جاتا تھا وہ ''شاہکار'' ہوتا تھا۔ جس بدقسمت مصنف کی وہ دو تین دفعہ اپنے رسالے میں تعریف کر دیتا۔ اس کے ادبی کیریر کا خاتمہ یقینی ہو جاتا۔ اور اس کے متعلق یہ پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ یہ بے چارہ ہمیشہ ایک ''تھرڈ ریٹ'' قلم گھسیٹ رہے گا اور زیادہ آگے نہ جائے گا۔ کتنے ہونہار نوجوانوں کو مولانا محمد خاں کی نگاہِ دیدہ رس نے دریافت کیا اور اُردو ادب سے روشناس کرایا۔ وہ دریافت ہوتے ہی ختم ہو گئے۔ مولانا محمد خاں کے اعجازِ قلم نے کئی ادبی ٹیلنٹیں ڈبوئیں اور اس کے کسی مصنف کے متعلق مبالغہ آمیز تعریفی جملے ہمیشہ اس بدقسمت مصنف کی ادبی زندگی پہ آخری نوحہ ثابت ہوتے تھے۔ ''خیالِ فرتوت'' کے صفحات میں ننھے ہونہار اُردو ادیب مولانا کی مسیحائی سے پیدا ہونے سے پہلے دفن ہوتے پڑے تھے۔

چودھری معراج دین کا "شاہین" غالباً "مجلّہ" کے ماسوا اُردو ادب کا سب سے پرانا رسالہ تھا۔ یہ اتنا ہی پرانا تھا جتنا چودھری معراج دین کے مورث اور اسے اس کے لکڑ دادے نے پہلے پہل جاری کیا تھا۔ "شاہین" کے متعلق سب سے حیرت خیز بات یہ تھی کہ چودھری معراج دین کے وقت سے اب تک اس نے اپنی روش نہ بدلی تھی۔ "شاہین" غدر کے زمانہ کے ایک پرانے بدحال امیر کی طرح تھا جو اپنی وضعداری نبھاتا جا رہا ہو۔ مالی لحاظ سے اُردو میں کبھی کوئی رسالہ اتنی استوار بنیادوں پر قائم نہیں ہوا، اُردو کا یہ واحد رسالہ تھا جس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ ماہ بماہ وقت پر شائع ہوتا رہا ہے اور غالباً اگلے سو سال تک ماہ بماہ وقت پر شائع ہوتا رہے گا۔ اور یہ کہ اس کے ٹائیٹل پر "شاہین" لکھنے کا انداز اور اس کے اُوپر وہ شعر:

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اسی طرح مستقبل کی پود کے سینے پر مونگ دلتے رہیں گے۔ بڑی چیز "شاہین" میں اس کی سفید پوشی اور بھلمنساہت تھی، تم کو اس کے صفحات میں کبھی کوئی چیز "خلافِ تہذیب" نظر نہ آئے گی اس میں افسانوں کے ہیرو اور ہیروئن کلیتاً جسم کے قدرتی حوائج کی ضرورت سے عاری ہوتے تھے، وہ کبھی گالی نہیں دیتے تھے، کبھی کپڑے اُتار کر بستر میں اکٹھے داخل نہ ہوتے تھے۔ یہ سب چیزیں خلافِ تہذیب تھیں اور "شاہین" ایک ہی ایسا رسالہ تھا جس نے ان ساٹھ سالوں کی اشاعت میں کبھی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا۔ اس سنجیدگی۔ متانت۔ وضعداری نے "شاہین" کو موجودہ پڑھنے والوں کے لئے بے حد خشک اور غیر دلچسپ بنا دیا ہے، اس میں چھپی ہوئی کسی سطر سے زندگی کی تلملاہٹ نہ آتی تھی۔ یہ ایک پرانے آدمی کی حنوط شدہ ممی کی طرح تھا..... تم کبھی جا بیٹھنے لگتے تھے کہ اس کے کسی افسانے کا ہیرو۔ ہیروئن کو زبردستی پکڑ

کر اس کی گردن کو کاٹ لے اور پھر اسے سامنے کے دھان کے کھیتوں کی طرف لے جائے مگر چودھری معراج دین کبھی اپنے آپ کو اتنی بدتہذیبی اور اوچھے پن کا مرتکب نہ ہونے دیتا تھا۔

"ہماں خیال فرتوت" میں کچھ چھپوانا پیدا ہوتے ہی مر جانے کے مترادف تھا، وہاں "شاہین" میں کسی مضمون کا چھپنا، مصنف کی طرف سے اس بات کا اقرار تھا کہ وہ ایک حنوط شدہ مردہ ہے جو ایک لمبے عرصے سے مر چکا ہے اور شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔

میاں چراغ دین جمبہ کے لئے ان دو رسالوں کے صفحات تو حاضر تھے مگر بڑے اصلی پایہ کے جدید رسالہ جواب سارے کے سارے ترقی پسند ہو گئے تھے، اس کی چیزوں کو اب اچٹتی نظر سے دیکھتے تھے اور ردی میں پھینک دیتے تھے۔ میاں چراغ دین ایک بلند ارادہ شخص تھا۔ وہ ادبی شہرت بنانا چاہتا تھا اور اپنی قوم کی قدرتی فراست اور ذہانت سے اس نے حالات کا جائزہ لیا کہ اگر وہ پرانی ڈگر پر چلتا رہا اور ڈرائنگ روم کے بورژواؤں کے متعلق افسانے لکھتا رہا تو وہ "شاہین" اور "خیال فرتوت" میں اچھی طرح اور آرام وہ طریق پر ہمیشہ کے لئے دفن ہو کر رہ جائے گا۔ اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ وہ رجعت پسند سے ترقی پسند ہو جائے گا۔ اس نے پہلے ترقی پسندوں کے خلاف تنقیدیں بھی لکھی تھیں جن کی وجہ سے ترقی پسند اسے اچھا نہیں جانتے تھے اور اگر وہ ذرا مشہور مصنف ہوتا تو وہ اس کو کبھی معاف نہ کرتے۔ میاں چراغ دین تائب اور معافی خواہ ہوا پارٹی کے سرکردہ ممبروں کے پاس گیا، اس نے اپنی پچھلی ادبی زندگی کے گھناؤنے جرم پر آنسو بہائے اور ان سے معافی چاہی، اس نے ان کو بتایا کہ حال ہی میں میکسم گورکی کی ایک افسانوں کی کتاب پڑھنے سے اس پر حقیقت کھلی ہے اور وہ ہمیشہ اب جو کچھ لکھے گا وہ دہقانوں اور مزدوروں کے حق میں ہوگا اور بورژوا نظام کے خلاف۔

بالکل ایسے جیسے سانپ اپنی کینچلی بدلتا ہے، چودھری چراغ دین چیمہ نے ادبی کینچلی بدل لی۔ ترقی پسندوں کا دل اس کی طرف سے ابھی صاف نہ ہوا تھا اور ان پر اپنے خلوص کا سکہ بٹھانے کے لئے وہ دور دراز ترین حدود تک چلا گیا۔ اس کا نام ترقی پسندوں کو ابھی کھٹکتا تھا اور یہ ایک ترقی پسندانہ نام بھی نہ تھا۔ اس نے اس کو بدل کر رزم خانی کر دیا۔ اس نے اس پر قناعت نہ کی اس نے اپنے آپ کو اس نئے رول میں اس تندہی اس ظاہری خلوص سے ڈال دیا کہ آہستہ آہستہ وہ بداعتمادی کا قلعہ جو اس نے اپنے پہلے مضامین سے ترقی پسندوں کے دل میں کھڑا کر لیا تھا نیچے گرنے لگا۔ ان کے ادبی جلسوں میں اس کی تقریریں سب سے جوشیلی اور تیز ہوتی تھیں۔ مباحثوں میں وہ پڑھے ہوئے مضمونوں کی بورژوائیت کے آثار پر زہریلی تنقیدیں کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس کی زبان کڑوی اور کسیلی تھی۔ ترقی پسندوں کے رسالوں میں اس کے مضمون نظمیں اور افسانے چھپنے لگے اور اس کے فوٹو بھی جن میں اسے اپنے نئے ساتھیوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دکھایا جاتا تھا۔ اس نے بورژوا فرسودہ نظام پر طنزیں لکھیں۔ طنزیں جو لمبی اور احمقانہ اور بے معنی ہوتی تھیں اور جسے خود ترقی پسند نہیں پڑھتے تھے۔ اس میں مزاح کی حس مطلق نہ تھی۔ ایک مشہور ترقی پسند مصنف نے اپنے رسالہ میں ایک طویل مقالہ لکھا، "رزم خانی ـــــ ہمارا عظیم ترین طنز نگار ـــــ اور چودھری چراغ دین چیمہ نے محسوس کیا کہ اس کی بھاگ دوڑ اکارت نہیں گئی اور یہ کہ اس نے اردو ادب کی عمارت میں اپنے لئے ایک مستقل گوشہ حاصل کر لیا ہے۔

خیر تو جب میں نے "ترقی پسندوں" کے اس معمار کو اپنے سامنے سے آتے دیکھا تو جلدی سے اس کی آنکھ بچا کر میں کٹار کو پکڑ کر سڑک کی دوسری طرف لے گیا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ شیخ قربان علی کٹار رزم خانی کو دیکھ پائے۔ ترقی پسند ادیب کٹار کے اعصاب کے حق میں اچھے نہیں۔ ان کو دیکھ کر اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ اس

کی مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں اور مرگی کے دورے کے سب آثار شروع ہو جاتے ہیں.....
ورنہ مجھے تو ترقی پسندوں سے اتنی ہی محبت ہے جتنی رجعت پسندوں یا تنزل پسندوں
سے۔ میں ان سب کو بلالحاظ مسلک، اور شکل اور اطوار جمع کرتا ہوں۔ محمد اقبال چنگیزی
کے دل کے غل ہیں وہ سب یکساں مقرب ہیں۔

ترقی پسند شیخ قربان علی کتار پر یہ جرت انگیز اشرکیوں کرتے ہیں۔ میں اس کے
بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ شیخ قربان علی کتار نے سوائے
ایک آدھ نظم کے کوئی ترقی پسندانہ چیز نہیں پڑھی۔ اس کے باوجود ان کے خلاف یہ
تعصب اور یہ غصہ اس کے دل میں گھرا جا نشین ہے۔ وہ کسی ترقی پسند کو اس طرح
سونگھ سکتا ہے جیسے کوئی کتا کسی خرگوش کو۔ میرا خیال ہے اس نفرت کے نیچے قربان علی
کتار کے ماضی کی تحت الشعوری پرچھائیں کارفرما ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ کیا ہے
قربان علی کتار اپنی تنگ دستی اور ناسا عدت زمانہ کے باوجود دل میں ایک بورژوا ہے
اور وہ ایک لغو یا نہ بورژوا ہے۔ اس نے کبھی یہ ولینا رمیت کے کسی ممبر کو کسی بورژوا پر
ترجیح نہیں دی اس کے تجربے نے اسے بتایا ہے کہ مصیبت کے وقت ہمیشہ بورژوے
کام آتے ہیں اور وہ ہی ایسے لوگ ہیں جو کسی شخص کو قمیضیں اُدھار دے سکتے ہیں۔

اس بات سے ڈرتے ہوتے کہ کہیں رزم حناتی ہمیں پھر نہ مل جاتے میں قربان علی کتار
کو جلدی سے اُوپر کو سے کے کافی ہاؤس میں لے گیا۔ بجلی کے فیل ہو جانے کی وجہ سے
کافی ہاؤس والوں نے ہر ایک میز پر ایک ایک موم بتی روشن کر رکھی تھی اور میزوں کے
گرد بیٹھے ہوئے چہرے زرد اور آسیبی لگ رہے تھے۔ اگرچہ ان کی آوازوں پر کوئی
دآسیبیت، نہ تھی۔ ہم ایک ستون کے پاس ایک خالی میز کے گرد جا بیٹھے اور بیرے محمد حسین
کو کافی کا آرڈر دے کر انتظار کرنے لگے۔ کتار آج خلاف معمول بے حد خاموش تھا اور میری
اسے باتیں کرانے کی کوشش رائیگاں ہو رہی تھی...... یکا یک کتار کا چہرہ پیلا پڑ گیا

اور اس کی انگلیاں کپکپاہٹ سے لرزاں ہونے لگیں۔ میں نے ایک مدھم کلک۔ کٹ۔ کٹ؛ سنی۔ اس نے سیدھے میری طرف دیکھتے ہوئے ایک خوف سے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔

" وہ پھر آگیا ہے۔ فغفور۔!"

" کہاں" میں نے ذرا جھنجلاہٹ سے کہا " مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔"

" وہ وہاں۔۔۔۔ " اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے آنکھ کی ایک حرکت سے اپنی دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ادھر دیکھتے ہی میرا سانس میرے حلق میں پھنس گیا۔ دائیں طرف میز پر وہی ترقی پسند ادیب رزم خانی بیٹھا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے دیکھ لیا ہے اور اب وہ میری میز پر آنے کی کوشش کرے گا مگر موم بتیوں کی دھیمی روشنیوں کی برکت سے وہ مجھے نہ دیکھ سکا تھا۔ میں نے جلدی سے پھونک مار کر اپنی میز پر رکھی ہوئی موم بتی بجھا دی۔

" کونسا جن! کٹار" میں نے کہا " وہ جن تو نہیں۔ وہ تو مشہور ترقی پسند ادیب خانی ہے۔"

" نہیں۔" کٹار بولا " وہاں نہیں۔ میرے پاؤں کے پاس دائیں طرف"

اس کے پاؤں کے پاس دیکھنے پر میں نے وہاں اس کالی چتی بلی کو پایا جو فرحین میرے کی پالتو تھی اور جسے تقریباً کافی ہاؤس کے ہر سرتی نے کبھی نہ کبھی اپنے پاؤں میں لپٹتے اور غرغراتے محسوس کیا تھا۔ شیخ قربان علی کٹار کو اس بلی میں فغفور جن نظر آرہا تھا!

" یہ تو بلی ہے" میں نے کہا۔

" کیا تمہیں یقین ہے۔" کٹار نے دبے لہجہ میں مجھ پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

" بالکل یقین ہے۔" میں نے کہا۔

جب کافی آئی تو کٹار نے جو عموماً اس پر کچھ وقت صرف کرتا ہے، اسے جلدی

سُڑک لیا اور اُسے ختم کر کے ہم فوراً نیچے اُتر آئے۔ ہم نے اس کے بعد الفنسٹن اسٹریٹ میں زیادہ پھرنا محفوظ اور مناسب نہ سمجھا اور سیدھے ایک وکٹوریہ میں بیٹھ کر کارپوریشن اسٹریٹ میں کٹار کے فلیٹ میں پہنچے۔ میں اس کے ساتھ اس وقت تک ٹھہرا رہا جب تک کہ اس کے حواس بجا نہ ہو گئے اور مسافر نیچے سے نہ آگیا اور پھر اسے وہاں چھوڑ کر اللہ توکل بیکری کو لوٹ آیا۔ میں اپنے دوست کے لئے بے حد متفکر تھا! خدا جانے وہ پروفیسر شاہسوار خاں کہاں اُڑ چھو ہو گیا ہے وہ شاید اس فغفور کے ناقابل فہم طرز عمل پر روشنی ڈال سکتا اور اس کا مداوا کر سکتا۔ "بہرحال"، میں نے اپنے آپ سے کہا، "میں کل ڈاکٹر غریب محمد سے کٹار کے اس اعصابی عارضہ کے متعلق بحث کروں گا۔"

دوسرے دن صبح میں زیریں ہوٹل میں ڈبل روٹیوں کی قطاروں اور کیکوں کے مرتبانوں کی اوٹ میں، ننگوٹا کسے پاکستان ریڈیو کی قوالی کی گت پر تیل کی مالش کر رہا تھا اور میرا دل ہمارے ریڈیو کے کارپردازان کے لئے شکریہ اور تعریف کے جذبات سے بھرپور تھا۔ جنہوں نے اقبال کی ایسی ایسی نظموں کو قوالی بنا کر دکھا دیا تھا جن کے متعلق کسی کو وہم وگمان نہیں ہو سکتا کہ ان کی قوالی ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر اقبال زندہ ہوتا تو یہ امر اس کے لئے غالباً بے حد تسکین دہ اور مسرت بخش ہوتا۔ اس نے غالباً پہاڑ اور گلہری، شکوہ اور جواب شکوہ اور دوسرے شاہکار اسی لئے لکھے تھے کہ اس کے مرنے کے بعد مہا قوال اور اس کے ساتھی انہیں دلنواز قوالیوں میں ڈھال کر علی الصبح ریڈیو پر سے نشر کیا کریں گے۔ انسانی قوت برداشت کی حدود ہوتی ہیں۔ ریڈیو والے انسانی صبر اور تحمل کو آزمائش میں ڈال کر اس حد تک لے آئے تھے جہاں وہ جواب دینے لگے تھے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان قوالیوں اور نغموں کی وجہ سے ہمارا ملک ایک صحیح اسلامی ملک بننے کے راستے پر تھا، ریڈیو والے اس کے لئے پوری تندہی سے بنیادیں بنا رہے تھے اور ذرہ بھر کسر نہ چھوڑ رہے تھے۔ جہاں تک اس مملکت کے ایک شہری۔ اقبال حسین چنگیزی کا تعلق ہے تو وہ ان قوالیوں کو صبح کی مالش اور ورزش کے لئے مناسب قسم کی پس پردہ موسیقی پاتا ہے اور --- اس کا دل ریڈیو کے کارپردازان کے لئے شکریہ اور تعریف کے جذبات سے بھرپور ہے۔

کوئی شخص اندر داخل ہوا۔ یہ شخص شیخ قربان علی کلار تھا۔ میں اس کی آمد کی توقع نہ کرتا تھا کیونکہ پچھلے تین چار دن سے اس کا ناشتہ وہیں کارپوریشن اسٹریٹ میں اس کے فلیٹ پر پہنچا دیا جاتا تھا اور اللہ توکل بیکری، اس عرصہ میں اس کی دید سے محروم رہی...... وہ میری بہترین قمیض پہنے ہوئے تھا، جسے دیکھ کر میرے کلیجے پر چھریاں چلنے لگیں اور میں اور شدت سے مالش کرانے لگا۔ مگر پھر اکڑے ہوئے کالر کے اوپر اس کا زرد پچکا ہوا چہرہ دیکھ کر اور یہ جان کر کہ وہ کس قدر بیمار اور مریض نظر آ رہا تھا۔ میرا غصہ دھیما ہو گا۔ آخر وہ کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ وہ بدمعاش حبیبہ، اور نامراد عاشق، کا شہرہ آفاق مصنف تھا اور اس کی ایجادی صلاحیتیں ابھی کسی طرح خشک نہ ہوئی تھیں۔ اس نے ابھی تک دنیا کو انسپکٹر شہباز خاں، اپنا شاہکار دینا تھا (اس وقت تک میرا یہی خیال تھا)

نزار جسم ـــــ زرد چہرے پر دیوانگی اور وحشت! وہ تاریخ کے مسلمہ عظیم عاشقوں (مجنوں، فرہاد وغیرہ) کی شاندار روایات میں ایک عاشق معلوم ہوتا تھا۔

"اقبال چنگیزی،" اس نے ایک درد انگیز لہجہ میں کہا "وہ آج کوچ کر گئی ہے،" وحشت نے مجھے پکڑ لیا۔ ہم نے رضیہ کو آخری پانچ چھ روز سے نہیں دیکھا تھا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے، کلار،" میں نے پوچھا "کہیں وہ مر......"

"اوہ! نہیں! نہیں!" کلار نے کہا "تم کیسے ایسی باتیں سوچ سکتے ہو۔ تمہیں اب تک اتنا ادب پڑھنے کے بعد یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ غیر فانی ہے، ابدی ہے۔ وہ مر نہیں سکتی۔ میرا مطلب تھا کہ وہ یہاں سے چلی گئی ہے۔"

میں نے کچھ دیر سوچا۔

"تمہارا مطلب ہے کلار،" میں نے بے تابانہ کہا "کہ وہ اور اس کا باپ کسی اور مکان میں اٹھ گئے ہیں۔ ہمارے دوست سلجوقی کو ایک مکان نہ ملنے کی وجہ سے سخت مصیبت ہے۔ میرا خیال ہے ابھی تین چار کمرانی بہادروں کو ساتھ لے کر مکان پر دھاوا کیا جائے اور قبضہ

کیا جاتے تھے....... (موجودہ کراچی میں مکان حاصل کرنے کا یہ ایک مانا ہوا طریقہ ہے اور جاکیوا ڈا کے کرائیوں کو ایک نیا پیشہ ہاتھ آگیا ہے)۔

"نہیں۔ اقبال حسین چنگیزی" کٹار دھیمے تہدیدی لہجہ میں بولا "انہوں نے مکان نہیں چھوڑا۔ اس کا باپ ابھی تک یہاں ہے۔ صرف لڑکی۔ رضیہ چار دن سے حیدرآباد میں اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ اسی لئے تو چنگیزی یار وہ ہمیں نظر نہیں پڑی۔ سنا ہے اس کی خالہ سخت بیمار ہے۔"

"انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔"

"نہیں۔ صرف سخت بیمار ہے۔ ابھی اس کی رُوح نے قفسِ عنصری سے پرواز نہیں کی مگر اُمید ہے کہ....."

"تمہارا اس کی خالہ نے کیا بگاڑا ہے۔"

"بالکل کچھ نہیں" کٹار بولا۔ "میں نے اس عورت کو کبھی نہیں دیکھا اور غالباً وہ سب خالاؤں کی طرح ایک نہایت نیک دل اور پرہیزگار عورت ہو گی۔ مگر تم جانتے ہو اگر رضیہ کی خالہ جلدی ہی ——— میرا مطلب ہے کہ اگر وہ اس طرح دیر تک بیمار پڑی رہی تو وہ میرے محبوبِ قلب کی مختار سمجھتے ہونا اب وہ جلدی واپس نہ آسکے گی۔"

"اس کی خالہ کہاں رہتی ہے" میں نے پوچھا۔

"حیدرآباد میں۔ اور کہاں!" اس نے جواب دیا جیسے کہ یہ ایک واضح چیز ہو۔ اس کا غالباً خیال تھا کہ اس نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ اس وقت شیخ قربان علی کٹار مجھے اپنی معلومات سے متحیر کر رہا تھا۔ راتوں رات ہی اسے کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ رضیہ اپنی خالہ کے پاس حیدرآباد چلی گئی ہے اور یہ کہ اس کی خالہ سخت بیمار ہے۔ شاید اس کی پہلی معلومات کی وسیلہ اس کے چچا کی لڑکی سکھر سے واپس آگئی ہو گی اور اس نے کٹار کو سب باتیں بتائی ہوں گی۔ لیکن کل رات کو جب میں نے اسے فلیٹ میں چھوڑا تو اسے ان

باتوں کا علم نہ تھا۔

"کیا اسے خواب میں دیکھا تھا۔؟"

" تمہیں یہ سب باتیں کس طرح معلوم ہوئیں۔" میں نے پوچھا۔

"پروفیسر شاہسوار خاں نے مجھ سے ان کا ذکر کیا۔"

"کیا؟ کنّار! تمہارا مطلب ہے پروفیسر شاہسوار خاں اپنے دورے سے واپس آگیا ہے۔"

" وہ رات کو مجھے تمہارے جانے کے بعد خواب میں ملا" کنّار نے کہا" تم جانتے ہی ہو وہ قطب ہے اور قطب اکثر اس طرح کرتے ہیں اس نے میری ہر طرح ڈھارس بندھائی اور مجھے خوشخبری دی کہ اب میری کامیابی نزدیک آرہی ہے اور محبوب کا وصال عنقریب ہوجائے گا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اسے فغفور کے قصّے کا علم تھا اور اس نے کہا اسے فغفور کے اس غیر معقول رویہ پر حیرت ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ خود اس سے اس بارے میں بات کرے گا۔ اور یہ کہ میرے لئے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ فغفور ذرا سوشل جن ہے پھر اس نے مجھے بتایا کہ میرا محبوب چند دنوں کے لئے اپنی خالہ کے پاس حیدرآباد گیا ہوا ہے۔ جو سخت بیمار ہے مگر جب میں چاہوں گا محبوب وہاں سے لوٹ آئے گا۔ اس کے بعد اس نے مجھے اپنا پتہ دیا اور ہدایت کی کہ اگلے دن ڈاک خانہ کھلتے ہی اسے اس پتہ پر پچیس روپے آٹھ آنے منی آرڈر کردوں۔ چنانچہ میرے یہاں صبح آنے کی ایک وجہ ہے۔"

" پچیس روپے میرے پاس نہیں ہیں" میں نے فوراً خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

" تمہیں معلوم ہے۔ کنّار۔ ڈیل روٹیوں کے بزنس میں زبردست سلمپ آگیا ہے کراچی کے بڑے بڑے بیکر خودکشیاں کر رہے ہیں۔۔۔"

" واقعی" کنّار نے کچھ انبساط سے کہا۔ وہ دوسرے لوگوں کی خودکشی کا سن کر خوش ہوجاتا ہے۔

"اور کیا!"، میں نے جواب دیا۔ "ایسا خوفناک سلمپ کبھی ڈبل روٹیوں کی مارکیٹ میں اس سے پہلے نہیں آیا۔ بہت سے لوگ ڈبل روٹیاں کھانے سے انکار کر رہے ہیں اور جتنی ڈبل روٹیاں پکائی جاتی ہیں مانگ اس سے چوتھائی بھی نہیں۔ صاف اقتصادیات کا مسئلہ ہے۔ اگلے دن حاجی علی محمد ولی محمد جونا بازار کا سب سے بڑا ابیکر سلمپ کا سنتے ہی فوراً اپنے ٹخنوں اور گھٹنوں کے بل چل کر اپنے تنور کے اندر چلا گیا اور جل کر راکھ ہوگیا۔

"اوہو!"، کمار کے تعجب میں انتباطی کیفیت تھی۔

"اور مشہور بیکر نور حسین ظہور حسین جو کراچی بیکروں کی انجمن کا صدر ہے، صدمے سے پاگل ہوگیا ہے۔ میں نے خود اس کو کل دوپہر پوسٹ آفس کے پاس ایک تار کے کھمبے پر چڑھے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں انجمن ڈبل روٹی فروشان کے سالانہ جلسے کی روئداد تھی اور وہ اس کی طرف اشارہ کر کے راہ گزاروں کو یقین دلا رہا تھا کہ یہ وہ کتاب ہے جو اس پر آسمان سے نازل ہوئی ہے۔"

"اوہو۔ ہوا ہوا واقعی خوفناک سلمپ ہے"، کمار نے ہوٹل کے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا "شکر ہے کہ تم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا...... ہاں تو جلدی سے بارہ پچیس روپے آمدنے کی زکوٰۃ نکال ہی دو۔ ایسے نازک وقت میں پروفیسر شاہسوار خاں کو ناخوش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔"

"اس معاملے کی کامیابی کا بڑا اچھا دارومدار اس کی مہربانی اور نوازش پر ہے۔"

"اس کا پتہ کیا ہے۔"، میں نے پوچھا۔

مولوی عبدالصمد عامل کامل طبیب روحانی شکاری دروازہ۔ حیدرآباد۔

"مولوی عبدالصمد کون ہے؟"

"تم جانتے ہو کہ پروفیسر شاہسوار خاں حیدرآباد میں مولوی عبدالصمد ہے۔ بزرگوں کے مختلف علاقوں میں مختلف نام ہو جاتے ہیں۔"

" مجھے اس کا علم نہ تھا۔" میں نے کہا "تو پروفیسر آج کل حیدرآباد میں ہے لیکن یار کنار اسے روپوں کی ضرورت ہے تو وہ فغفور وغیرہ سے کیوں نہیں کہتا۔"

" غالباً وہ میری آزمائش کرنا چاہتا ہے۔" کنار نے جواب دیا۔

میں نے کچھ دیر سوچ کر کہا "تمہیں یقین ہے وہ خواب میں تمہارے پاس آیا تھا۔"

" ہاں چنگیزی یار۔" اس نے کہا "وہ قطب ہے۔"

" دیکھو کنار!" میں نے اسے سمجھایا "پروفیسر کو ایک دو بار پھر خواب میں آنے کا موقع دو۔ اگر تم نے اس کی پہلی ہدایت پر ہی اسے پچیس روپے دے کر تعمیل کر دی تو ممکن ہے وہ پھر خواب میں یا اس کے باہر تمہیں شکل نہ دکھائے۔ عموماً قطب لوگ تین، چار بار آتے ہیں۔"

" دیکھو چنگیزی!" اس نے کہا "یہ اس معاملہ کی نازک ترین اسٹیج ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے بنا بنایا کام بگڑ نہ جائے۔"

اچھا جب وہ دوسری دفعہ تمہیں خواب میں یہ ہدایت کرے گا تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں فوراً پچیس روپے اسے منی آرڈر کرنے کا انتظام کر دوں گا۔" میں نے کہا "ہاں یہ بتاؤ کہ تم کو مشق کرتے کتنے دن ہو گئے ہیں۔"

" آج مشق کا آخری دن ہے۔ یعنی پندرھواں۔" اس نے کہا "کل میں انگوٹھی پر عمل کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔"

" گویا کل تمہاری ہر خواہش پوری ہو سکتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ " فغفور اور اس کے سب ساتھی تمہارے غلام ہوں گے۔ دیکھو کل عمل کرتے وقت جب حضرت سلیمان کی بارگاہ میں تم اپنی خواہش عرض کرو تو وہ خواہش یہ ہو کہ تمہاری محبوب حیدرآباد سے فوراً لوٹ آئے۔ اگر اس سے طلسمی انگوٹھی کے خالص چیز ہونے کا ثبوت مل جائے گا۔ اگر انگوٹھی میں کچھ کرامات ہے اور پروفیسر شاہسوار خاں حقیقی قطب ہے تو رضیہ

فوراً لوٹ آئے گی۔ اگرچہ کنار یار! مجھے ابھی اس کا یقین نہیں کہ تمہاری محبوب حیدرآباد میں ہے۔"

"تم اس میں کیسے شک کر سکتے ہو۔" اس نے کہا "قطب کی بات نہ ماننا کفر ہے۔ سو کل رات کو میں آٹھ بجے تمہارا انتظار کروں گا۔ اور اس وقت تک عمل شروع نہ کروں گا جب تک تم نہیں آتے مجھے اب انگوٹھی کے ساتھ اکیلے خوف سا لگتا ہے۔"

کنار کے جانے کے بعد کوئی گیارہ بجے میں اللہ توکل' راسٹوران میں ایک نئی ادبی شخصیت کو اپنی راہ پر لا رہا تھا میں چاق و چوبند اس کی خدمت پر استادہ تھا اور دیکھ رہا تھا کہ اس کی میز پر مرغوب ترین ماکولات اور مشروبات کا فقدان نہ ہونے پائے اور بڑے آدمی کا ادبی ذائقہ پورے طور پر تسکین پذیر ہو۔ یہ شخص مسٹر شداد بیشی، مشہور انقلابی شاعر تھا (وہ ایک بھیگی ہوئی بلی کی طرح نظر آتا تھا جو چھپکے جانے اور پچکارنے کے لئے ترس رہی ہو) میں نے اسے ایک گھنٹہ پہلے مارکیٹ کے گھنٹہ گھر کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ اور اس کو اردو رسالوں میں اس کے فوٹوں سے پہچان کر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ شداد بیشی، چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ایک پتلا سا نرم مزاج بزدل سا شخص تھا جو ہر وقت ایک احمقانہ اور مدافعانہ طریق پر مسکراتا تھا اسے دیکھ کر یہ قطعاً یقین نہ آتا تھا کہ وہی ان آتشیں اور تیز انقلابی نظموں کا مصنف ہے جنہوں نے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک اردو ادب میں تہلکہ سا مچا رکھا تھا۔ شیخ قربان علی کنار کی طرح وہ بھی اب تقریباً فراموش شدگان میں تھا۔ اگرچہ ایک وقت وہ نوجوان طالب علموں کا ادبی دیوتا تھا اور اس کا نام ہر ایک کے ہونٹوں پر ہوتا تھا۔ ادب ایک بے وفا اور سنگدل داشتہ ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ایسی جوشیلی نظموں کا سکوپ نہ رہا اور کوئی ایسا شخص نہ رہا جس کے خلاف شداد بیشی اپنا تُند مجالا استعمال کر سکتا۔ اس نے اسے کچھ ناخوش بنا دیا۔ شاعری کی ایک ہی نوع جس میں وہ اپنی جولانیاں پورے کمال سے دکھا سکتا تھا۔ انقلابی شاعری تھی۔

اس میں وہ رزم خیالی جیسی اپنے آپ کو زمانہ اور حالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت مفقود تھی اور شداد بیتھی کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا گیا۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ وہ رنان سنس، لکھتا رہا ہے.... مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں کافی ادبی قابلیت تھی اور پرانے طرزِ خیال کے باوجود اس کی بعض چیزوں میں گہرائی اور شعریت کی اصل رُوح موجود تھی۔ اس کی بعض انقلابی اور عشقیہ نظمیں کئی جدید مبینہ لائنڈ شاہکاروں سے ندرتِ خیال اور لطافتِ بیان کی حیثیت سے کہیں اچھی تھیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہ تھا کہ شداد بیتھی کو اب اردو ادب کے طاقِ نسیان پر رکھ دیا گیا تھا اور جلدی تیزی سے اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ اس کا کلام اب بھی کبھی کبھی مولانا محمد خاں کے 'خیال فرتوت، میں چھپتا تھا اور مولانا محمد خاں اپنے شذرات میں اس کی تعریف میں بھی کبھی بخل سے کام نہ لیتا مگر خیال فرتوت، کے بیشتر پڑھنے والے زیادہ ریٹائرڈ لوگ تھے اور مولانا محمد خاں خود اب اُردو ادب کے گرانڈ اولڈ مین کی بجائے ایک قسم کا اردو ادب کا رکھیا نڈا اولڈ کلاؤن، بن گیا تھا۔

شداد بیتھی کی زندگی کے حالات اس تاریخ کے سکوپ میں نہیں ہیں، پھر بھی اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان معدودے چند اردو ادب کے ادیبوں میں سے ہے۔ جنہوں نے اپنے گزران کے لئے حقیر سے حقیر کام کرنے سے عار نہیں برتی اور جس نے اپنی روٹی ہمیشہ اپنے خون پسینہ سے کما کر کھائی۔ جب وہ اپنی انقلابی نظمیں لکھ رہا تھا اور ادبی لحاظ سے مشہور ہستی بن چکا تھا، وہ لاہور کی ایک گمنام گلی میں جلد سازی کی دوکان پر بیٹھا ہوا اکثر نظر آیا کرتا۔ جب اس کے زیادہ فارغ البال دوست اسے مربیانہ طریق پر کسی کھانے یا پارٹی پر مدعو کرتے تو وہ ہمیشہ عذر کرنے کی کوشش کرتا اور یہ بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ جب اس کی جلد سازی کی دوکان ناکامیاب ہو گئی تو کچھ مدت تک وہ اینٹیں ڈھو کر مزدوری کرتا رہا ہے اس نے اس وقت کیا جب

ادبی دُنیا اس کے نام سے گونج رہی تھی اور جہاں اردو کے اس دور کے بہترین شاعروں کا ذکر آتا اس کا نام فہرست کے پہلے تین میں لیا جاتا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔

کھانے کے دوران میں شداد پنشی کے سنہری دن، موضوع رہے اور جب کبھی وہ کوئی ادبی قصہ یا واقعہ سناتا وہ ان کو اس طرح شروع کرتا "جب میں قطب روڈ میں جلد سازی کی دوکان کرتا تھا" یا "میں سٹیشن سے صندوق اٹھا کر ریسٹوران میں" اس نے بے حد دلچسپی کا اظہار کیا اور مجھے رازدارانہ طریق پہ بتایا کہ ایک دفعہ اس کا بھی بالکل اسی قسم کا راسٹوران چلانے کا ارادہ ہوا تھا ——— پرسکون اور صاف ستھرا گھر۔ وہ روپے کی کمی کی وجہ سے یہ نہ کر سکا تھا۔ اپنی ادبی "فراموش شدگی" پر اس کے دل میں تلخی کا شائبہ تک نہ تھا۔ جب میں نے اس سے شیخ قربان علی کنار کا ذکر کیا تو اس کا چہرہ روشن ہو گیا اس نے کہا "کنار اور پنشی دونوں مردہ شیر ہیں" اس نے مجھ سے اقرار کیا کہ اس نے کنار کے تقریباً سارے جاسوسی ناول پڑھے تھے اور ابھی تک وہ ان کے جادو کو اپنے سے پوری طرح جھنجھوڑ کر اتار نہ سکا تھا اور بعد میں جب اس نے جدید ترقی پسندوں کے شاہکار پڑھے تھے تو ان سے اسے اس کا آدھا لطف بھی حاصل نہیں ہوا جو کنار کے جاسوسی ناولوں نے اسے دیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں کنار سے اس کو ملاؤں گا اور پھر اس نے ایک عجیب سوال کیا کہ کنار اپنی گزران کے لئے کیا کرتا ہے عجیب اس کے لئے کہ بہت تھوڑے مصنف کسی دوسرے مصنف کے بارے میں یہ سوال کرتے ہیں کیونکہ یہ تسلیم شدہ ہوتا ہے کہ مصنف اپنی گزران کے لئے کچھ نہیں کرتے اور زیادہ تر ایڈیٹروں کی فیاضی اور دوستوں کے چندوں پر رہتے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ امپورٹ آفس میں ایک کلرک تھا، مگر اب وہ بیکار ہے۔

"تم اس کو یہاں ہوٹل میں کسی کام پہ کیوں نہیں لگا دیتے؟" اس نے بغیر کسی الجھن کے کہا۔ "اور ویسے باتوں باتوں میں۔ مسٹر اقبال! میں سوچ رہا تھا کہ کیا تمہیں اس ہوٹل

میں کسی ٹیبل بوائے وغیرہ کی ضرورت ہے جو پلیٹیں وغیرہ دھو سکے۔ مجھے اس کام میں کچھ تجربہ ہے"۔

جب میں نے اس کا مطلب سمجھا تو میں فی الواقع سراسیمہ سا ہو گیا۔ اگرچہ میں خود مزدوری کی عزت کا قائل ہوں مجھے اس کی توقع نہ تھی کہ وہ شداد بیٹھی۔ میری پلیٹیں دھونے کے کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کرے گا "میں تیس روپے ماہوار اور کھانے پر آنے کو تیار ہوں"۔ اس نے کہا۔ "اور میں اپنے کام میں پورا ٹرینڈ ہوں"

یہ خیال میرے لئے ناقابل تصور تھا۔ بیٹھی، اللہ توکل، ہوٹل میں پلیٹیں دھوتا ہو۔ اس کے چہرہ پر فاقے کے آثار تھے اور اس کی یہ درخواست ظاہر کرتی تھی کہ وہ کام کے لئے غالباً کئی دن سے سرگرداں ہے اور اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہے۔ میں نے اس سے بحث کی کہ وہ ویسے ہی میرے ساتھ رہ سکتا ہے اور اس عرصہ میں وہ کسی ایسے کام کی تلاش جاری رکھ سکتا ہے جو اس جیسے آدمی کے پایہ کے مناسب ہو۔ حکومت کے کسی ادبی رسالہ کی ادارت وغیرہ۔ مگر یہ اسے قبول نہ تھا۔ کھانے کے بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے کہا کہ وہ مجھے بل ہفتہ کے اندر اندر ادا کر دے گا۔ جب اسے کوئی کام نہ ملا اور میں نے یہ دیکھ کر کہ وہ میرے ساتھ اگر رہنے پر رضامند ہو گا تو اپنی شرائط پر، ہچکچاہٹ سے اس کے باورچی خانہ کے انچارج بننے کی اس سے پیشکش کی۔ اس نے کہا کہ وہ اگرچہ ایک عمدہ باورچی ہے مگر وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی جگہ پیدا کرنے کے لئے پہلے باورچی کو نکالا جائے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہمارے پاس اس وقت کوئی باورچی مستقل نہیں ہے تو رضامند ہو گیا اور وہ بھی تنخواہ کے اپنے شرائط پر۔ وہ بتیس روپے ماہوار اور کھانے پر کام کرے گا۔

اس کے لُٹے ہوئے چہرے کو دمکتا دیکھ کر مجھے اس کا احساس ہوا کہ اس کی ضرورت کس قدر سخت اور شدید ہو گی۔ اس نے اس وقت خود ہی میز پر سے پلیٹیں اُٹھا کر اپنے

میں کسی ٹیبل بوائے وغیرہ کی ضرورت ہے جو پلیٹیں وغیرہ دھو سکے۔ مجھے اس کام میں کچھ تجربہ ہے''۔

جب میں نے اس کا مطلب سمجھا تو میں فی الواقع سراسیمہ سا ہوگیا۔ اگرچہ میں خود مزدوری کی عزت کا قائل ہوں مجھے اس کی توقع نہ تھی کہ وہ شنداد یشی۔ میری پلیٹیں دھونے کے کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کرے گا۔ "میں تیس روپے ماہوار اور کھانے پر آنے کو تیار ہوں"۔ اس نے کہا۔ "اور میں اپنے کام میں پورا ٹرینڈ ہوں"۔

یہ خیال میرے لئے نا قابل تصور تھا۔ یشی، اللہ توکل، ہوٹل میں پلیٹیں دھوتا ہو۔ اس کے چہرہ پر فاقے کے آثار تھے اور اس کی یہ درخواست ظاہر کرتی تھی کہ وہ کام کے لئے غالباً کئی دن سے سرگرداں ہے اور اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہے۔ میں نے اس سے بحث کی کہ وہ ویسے ہی میرے ساتھ رہ سکتا ہے اور اس عرصہ میں وہ کسی ایسے کام کی تلاش جاری رکھ سکتا ہے جو اس جیسے آدمی کے پایہ کے مناسب ہو۔ حکومت کے کسی ادبی رسالہ کی ادارت وغیرہ۔ مگر یہ اسے قبول نہ تھا۔ کھانے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے کہا کہ وہ مجھے بل ہفتہ کے اندر اندر ادا کر دے گا۔

جب اسے کوئی کام نہ ملا اور میں نے یہ دیکھ کر کہ وہ میرے ساتھ اگر رہنے پر رضامند ہوگا تو اپنی شرائط پر، ہچکچاہٹ سے اس کے باورچی خانہ کے انچارج بننے کی اس سے پیشکش کی۔ اس نے کہا کہ وہ اگرچہ ایک عمدہ باورچی ہے مگر وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی جگہ پیدا کرنے کے لئے پہلے باورچی کو نکالا جائے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہمارے پاس اس وقت کوئی باورچی مستقل نہیں ہے تو رضامند ہوگیا اور وہ بھی تنخواہ کے اپنے شرائط پر۔ وہ بتیس روپے ماہوار اور کھانے پر کام کرے گا۔

اس کے لٹتے ہوئے چہرے کو دمکتا دیکھ کر مجھے اس کا احساس ہوا کہ اس کی ضرورت کس قدر سخت اور شدید ہوگی۔ اس نے اس وقت خود ہی میز پر سے پلیٹیں اٹھا کر اپنے

میری آپ سے ایک درخواست ہے یہ ایک خلاف معمول اور ناجائز درخواست ہے کیا آپ مجھے میری ایک ماہ کی تنخواہ بطور پیشگی دے سکتے ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں، آپ جتنا چاہیں لے سکتے ہیں۔"

"بات یہ ہے" پشمی نے اپنی بات کو جاری رکھا —" اس پروفیسر نے مجھے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ میں فوراً ملازمت ملتے ہی اسے اس کے پتہ پر بیس روپے آٹھ آنے منی آرڈر کر دوں۔"

"آپ کو بھی یہ اس نے کہا تھا،" میں ہکا بکا رہ گیا۔

"آپ جانتے ہیں" اس نے کہا "اقبال صاحب — میرے لئے اتنا کچھ کرنے کے بعد میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا۔"

"نہیں" میں نے کہا، میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ آخر میں نے پوچھا۔

"اس نے اپنا پتہ کیا بتایا تھا؟"

"اپنا پتہ اس نے دو تین دفعہ دوہرایا تھا — مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"معالج امراض روحانی مولوی عبدالصمد اندرون شکاری دروازہ۔ حیدرآباد سندھ۔"

جب میں نے کاؤنٹر پر سے صندوقچی میں سے تیس روپے نکال کر اپنے نئے مہتمم باورچی خانہ کی ہتھیلی پر رکھے تو مجھ سے قسم لے لو اگر مجھے یہ پتہ ہو کہ میں اپنے سر پر کھڑا ہوں یا پاؤں پہ۔ دنیا گویا اوپر نیچے ہو گئی تھی اور پروفیسر شاہسوار یا مولوی عبدالصمد اپنے چھوٹے ستاروں فغفور اینڈ کو کے درمیان فضا میں ایک وسیع دیو کی طرح حاوی نظر آنے لگا۔

پھندوں بیان کو ایک فنکارانہ مہارت سے متوازن کرتے ہوئے کہا "سیٹھ! تم جانتے ہو! یہ سب انگوٹھی کا معجزہ ہے۔"

"انگوٹھی کا!" میں نے کہا "سیٹھی صاحب، کونسی انگوٹھی کا۔ وہ پروفیسر شاہسوار خاں کی طلسمی انگوٹھی تو نہیں؟"

"وہی" اس نے کہا "بالکل وہی! مجھے کراچی میں آئے ایک مہینہ ہو گیا ہے اور اس وقت سے میں ملازمت میں سرگرداں ہوں۔ پندرہ دن ہوئے جب میں بالکل ناامید ہو چکا تھا، میں نے گاؤں میں ایک پروفیسر کو یہاں چاکی واڑا کے ایک باغیچے میں وہ طلسمی انگوٹھی بیچتے دیکھا۔ میں عموماً ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتا مگر اس وقت میں اس درجہ مایوس ہو چکا تھا اور پروفیسر کے الفاظ میں اتنی صداقت تھی کہ میں نے یہ انگوٹھی خرید لی۔ اب تک میں آس پر دس منٹ مشق کرتا رہا ہوں اور کل اس پر عمل کرنے کا دن ہے.... مگر سچی بات ہے کہ میں اس انگوٹھی سے زیادہ توقع نہیں رکھ رہا تھا اور اس کے بارے میں سب کچھ بھول رہا تھا کہ کل رات جب میں میکلوڈ روڈ کی پٹری پر سویا ہوا تھا، وہی انگوٹھی بیچنے والا مجھے خواب میں نظر آیا۔ "جا بیٹا! تیرا بیڑا پار ہوا،" اس نے کہا "کل شاہسوار کی برکت سے تجھے ملازمت مل جائے گی۔" اور آج واقعی مجھے ملازمت مل گئی ہے۔"

تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ سیٹھی کے اس بیان کے بعد میں کتنا متحیر ہو گیا ہوں گا۔ پروفیسر شاہسوار خاں مجھے اب محض ایک ڈھونگیا اور پیسہ بٹورنے والا فتنہ نہ لگا۔ وہ اب میرے لئے وسیع اور آسیبی طاقتوں کا مالک ہو گیا۔ سیٹھی یقیناً سچ بول رہا تھا اور اس کے لئے جھوٹ بولنے کا کوئی جواز نہ تھا.... مگر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز انکشاف، ابھی میرا منتظر تھا!

"اقبال صاحب" سیٹھی نے کچھ معذرت کے لہجے سے کہا "مجھے افسوس ہے مگر

میری آپ سے ایک درخواست ہے یہ ایک خلاف معمول اور ناجائز درخواست ہے کیا آپ مجھے میری ایک ماہ کی تنخواہ بطور پیشگی دے سکتے ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں! آپ جتنا چاہیں لے سکتے ہیں۔"

" بات یہ ہے" پشمی نے اپنی بات کو جاری رکھا ـــ" اس پروفیسر نے مجھے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ میں فوراً ملازمت ملتے ہی اسے اس کے پتہ پر بیس روپے آٹھ آنے منی آرڈر کردوں۔"

"آپ کو بھی یہ اس نے کہا تھا" میں ہکا بکا رہ گیا۔

"آپ جانتے ہیں" اس نے کہا "اقبال صاحب ـــ میرے لئے اتنا کچھ کرنے کے بعد میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا۔"

" نہیں" میں نے کہا۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ آخر میں نے پوچھا۔

" اس نے اپنا پتہ کیا بتایا تھا؟"

" اپنا پتہ اس نے دو تین دفعہ دوہرایا تھا ـــ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

" مُعالج امراض روحانی مولوی عبدالصمد اندرون شکاری دروازہ۔ حیدرآباد سندھ"

" جب میں نے کاؤنٹر پر سے صندوقچی میں سے تیس روپے نکال کر اپنے نئے مہتمم باورچی خانہ کی ہتھیلی پر رکھے تو مجھ سے قسم لے لو اگر مجھے یہ پتہ ہو کہ میں اپنے سر پر کھڑا ہوں یا پاؤں پر۔ دنیا گویا اُوپر نیچے ہوگئی تھی اور پروفیسر شاہسوار یا مولوی عبدالصمد اپنے چھوٹے ستاروں فغفور اینڈ کو کے درمیان فضا میں ایک وسیع دیو کی طرح حاوی نظر آنے لگا۔

اس دن شام کو جب میں کٹار سے ملنے کے لئے کارپوریشن اسٹریٹ میں گیا۔ قصاب کے فلیٹ کی سیڑھیوں کے دروازے پر مجھے سیاہ ڈھیلے سوٹ اور ایک قدیمی سولا ہیٹ میں ایک آشنا اور مشہور صورت نظر آئی۔ یہ ڈاکٹر غریب محمد تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں دواؤں کا اٹیچی کیس تھا اور وہ گلے میں مالا کے طور وہ ربڑ کی نلکی پہنے تھا جسے طبی اصطلاح میں سٹیتھو سکوپ کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر غریب محمد میرے عزیز ترین دوستوں میں سے ہے اور اس کے متعلق ایک مکمل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ چاکی واڑا کی طبی تاریخ اس شہر میں ڈاکٹر غریب محمد کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ وہ چاکی واڑا کا مسیحائے اعظم ہے۔ شروع شروع میں ڈاکٹر غریب محمد چاکی واڑا میں نزول سے کئی سال پہلے ریاست بہاولپور کے ایک موضع میں پٹواری تھا۔ اس نے طبابت کا پہلا تجربہ انہی دنوں میں حاصل کیا اور اس کے پہلے مریض اس کے دہقان ہوتے تھے۔ چاکی واڑا میں اس کا نزول کیسے اور کن حالات میں ہوا۔۔۔ ڈاکٹر غریب محمد کی زندگی کا وہ حصہ کچھ تاریکی میں ہے، ڈاکٹر خود اس حصے کے بارے میں بے حد کم گو ہے (عموماً کم گو ہونے کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا)۔

۱۹۳۳ء میں جب وہ اٹھائیس سال کا ایک نوجوان ہوگا، اس نے کارپوریشن اسٹریٹ میں پہلے پہل اپنی ڈاکٹری کی دوکان کھولی جہاں اس نے کباڑیوں سے خریدی ہوئی استعمال شدہ شیشیوں میں اپنی چھپکلیوں، مینڈکوں اور جڑی بوٹیوں کو سجایا۔ ان دنوں اکثر سانڈے بھی اس کی دوکان پر گاہکوں کے پاؤں میں رینگتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور کئی عورتیں ڈر کے

مارے غش کھا جاتی تھیں، اسے روحانی امراض کے علاج میں بھی کچھ بہرہ وری تھی اور وہ خصوصاً عورتوں کے جن اُتارنے میں ماہر تھا، وہ ڈھائی روپیہ فی جن فیس لیا کرتا تھا (گزرے ہوئے زمانے تھے) وہ چرب زبان اور معاملہ فہم تھا اور ان پڑھ جاہل طبقہ کو رام کرنے کے گروں سے خوب واقف تھا۔ اس نے عورتوں کے امراض کے ماہر کی حیثیت سے کافی شہرت پیدا کی اور اچھا خاصا روپیہ کمایا۔ چاکی واڑا کے کئی مستقبل کے شہری اس کے ہاتھوں میں سے اس دُنیا میں آئے۔ جب اس نے کچھ روپیہ کما لیا تو ۱۹۲۰ء میں جنگ کے بعد چاکی واڑا کے مہذب حصے مڈل وے اسٹریٹ میں ایک بڑی اور بہتر دوکان خرید لی۔ وہ کچھ کچھ وقت اور ماحول کے ساتھ ترقی کر رہا تھا اور اگرچہ اس نے ابھی تک چھپکلیوں اور سانڈوں کی تاثیر میں اپنا یقین مکمل طور پر نہ کھویا تھا، وہ مڈل وے اسٹریٹ کے ذرا مہذب گاہکوں کا پاس رکھنے کے لئے اس نئی دوکان میں انگریزی پیٹنٹ ادویات بھی رکھنے لگا۔ اس نے دوکان پر ایک بڑا بورڈ لگا دیا!

ڈاکٹر غریب محمد، وی جی۔ ایم۔ او۔ ڈی
ماہر امراض خصوصی زنانہ و مردانہ
یہاں امراض روحانی کا علاج بھی کیا جاتا ہے

کبھی کسی نے یہ تفتیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ یہ وی۔ جی۔ ایم او۔ ڈی کیا ہے۔ اب بھی چاکی واڑا میں بہت تھوڑے جانتے ہیں کہ آیا ڈاکٹر غریب محمد ایک سند یافتہ اور کوالیفائیڈ ڈاکٹر بھی ہے۔ چاکی واڑا ایک حقیقی خود مختار سلطنت ہے اور ہر ایک کی اپنی مرضی ہے کہ جو اپنے آپ کو لکھنے لگے۔ ڈاکٹر غریب محمد اپنی بیوی کے لحاظ سے خوش قسمت تھا اور اب ڈاکٹر کو مجبوراً اکیلا چھوڑ کر کسی مکرانی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ وہ ایک فی الواقع اچھی اور تجربہ کار دایہ ہونے کی وجہ سے غریب محمد کے لئے اس کی مڈل وے اسٹریٹ میں پریکٹس کے ایام کے اوائل میں بے حد کارآمد ثابت ہوتی . . . .

نئی انگریزی دوائیں دوکان پر لا رکھا، ڈاکٹر عزیب محمد کے لئے مالی لحاظ سے اچھا تھا۔ مگر اس کے مریضوں کے لئے اتنا اچھا نہ تھا۔ ان کی زندگیاں اب پہلے سے زیادہ خطرہ میں پڑ گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے کئی بار اقرار کیا کہ وہ اپنی چھپکلیوں اور بینڈکوں سے علاج کرنے میں زیادہ اعتماد محسوس کرتا ہے بہ نسبت ان نئی پیٹنٹ دواؤں سے مگر مصیبت یہ تھی کہ اب کئی جدید مریض پرانی معجونوں کے بارے میں کچھ تنک مزاج ہو چلے تھے...... میں اعداد و شمار سے ثابت کر سکتا ہوں کہ ہرامیڈ سے بار کے قبرستان کو آباد کرتے میں ڈاکٹر عزیب محمد کا کوئی کم حصہ نہ تھا۔ کئی بار جب وہ اپنے مریض کو نسخہ دے کر مریض کے گھر کے باہر گلی کے موڑ پر ہی ہوتا تو مریض اپنے خالق کے پاس پہنچ جاتا۔

اس کی سٹیتھوسکوپ کی بھی ایک تاریخ تھی۔ اس نے اسے ایک کباڑیئے کی دوکان سے خرید لیا تھا۔ نلکی میں ایک دو جگہ سوراخ تھے اور دھات کا حصہ بوسیدہ اور زنگ آلود ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ جب اس نے اسے پہلے پہل خریدا تھا اس کو کانوں پر لگانے سے "شوں۔ شڑاخ۔ شڑپ" کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ وہ آوازیں کافی مدت سے اس سے آنی بند ہو گئی تھیں اور کیونکہ ڈاکٹر کے لئے ان آوازوں کا پہلے بھی کوئی مطلب نہ تھا، اس کے لئے آوازوں کے نہ ہونے سے کوئی فرق پیدا نہ کیا۔ اس نے مجھ سے اقرار کیا کہ ذاتی طور پر اسے اس چیز پر کوئی اعتماد نہیں مگر مریضوں کو مرعوب کرنے میں اس نے اس سے مؤثر کسی اور شے کو نہیں پایا ہے۔

ڈاکٹر عزیب محمد جاگی واڑا کے کئی گھروں میں عزرائیل کا پیشرو بن کر جا چکا تھا، اس کے باوجود جاگی واڑا والوں کو اس پر ایک ایجون جیسا عقیدہ تھا اور بہ نسبت کسی اور کی گولیوں کے، وہ عزیب محمد کی گولیوں سے جان دینے کو ترجیح دیتے تھے۔

میں نے عزیب محمد کو کمرانی قصاب کے فلیٹ پر کھڑے دیکھا تو سمجھ گیا جب جاگی واڑا کا کوئی شہری کسی ڈاکٹر کو بلانے پر آمادہ ہوتا ہے اور وہ ڈاکٹر عزیب محمد ہوتا ہے تو یہ فوراً

یتفش سے استخراج کیا جاسکتا ہے کہ وہ شخص بڑا سخت بیمار ہے۔ کوئی قصاب کے فلیٹ
میں سخت بیمار تھا۔ کیا یہ خود قصاب تھا! میں نے ڈاکٹر کو السلام علیکم کہا۔

"سناؤ! ڈاکٹر! یہاں کیسے کھڑے ہو۔!"

"میں عمر قصاب کو دیکھنے کے لئے اُوپر جا رہا تھا کہ تمہیں دیکھ کر رُک گیا۔"

"عمر قصاب کونسا۔"

"وہی ـــــ بھئی لی مارکیٹ کا قصاب! وہ کچھ زیادہ بیمار معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ابھی اس کا ایک آدمی مجھے آنے کے لئے کہہ گیا ہے مگر اقبال صاحب مصیبت یہ ہے کہ لوگ غریب ڈاکٹر کو ہمیشہ اس وقت بلاتے ہیں جب پانی سر سے گزر چکتا ہے ـ ہاں بھئی۔ اقبال صاحب اس سٹی پولیس اسٹیشن کے سب انسپکٹر صاحب سے تمہاری کچھ علیک سلیک ہے۔"

میں نے سمجھا کہ شاید وہ اپنی خود عطا کردہ طبی سندوں کی وجہ سے پولیس والوں کے ساتھ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے مگر معاملہ اس قدر سنگین نہ تھا۔ بعض مفسد لوگ پچھلی شام کو اس کی بھینس کو تھان پر سے کھول کر لے گئے تھے (جا کی واڑا میں اب بھی پرائیویٹ بھینس رکھنا ممکن ہے) اور وہ چاہتا تھا کہ میں سب انسپکٹر سے کہلوا کر اس کی بھینس چوروں سے نکلوا دوں۔ میں نے اس سے اس کا وعدہ کیا کہ میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔

"بھینس کے بغیر مجھے بے حد تکلیف ہے" اس نے کہا "کراچی کی آب و ہوا میں بھینس کے خالص دودھ کے بغیر کوئی شخص قوت مردانگی قائم نہیں رکھ سکتا ـ تمہارے گلے کا کیا حال ہے۔"

چار دن پہلے جب میں اسے ملا تھا تو زیادہ سگریٹ پینے کی وجہ سے میرا گلا دکھ رہا تھا۔ اور میں نے اس سے اس کے اصرار پر پینٹ کرایا تھا اور چار آنے فی گولی کے حساب سے

اس کے مشورہ پر اس سے ایک درجن کڑوی مشکوک سی سفید گولیاں خریدنے پر مجبور ہوا تھا۔
میں نے اسے بتایا کہ اب بالکل ٹھیک ہے۔ مگر اس نے اصرار کیا کہ میں اسے گلا کھول کر دکھاؤں
اس نے ٹارچ کی روشنی اس میں ڈال کر بغور اس کا معائنہ کیا اور پھر اپنا سر نفی میں ہلایا۔

"ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ پکا ہوا ہے۔" اس نے کہا "کل دوکان پہ آنا۔ میں تم کو ایک درجن مزاحمتی پلیز اور دوں گا ــــ اچھا بھئی اقبال صاحب میں عمر کو دیکھ آؤں۔"

یہاں مجھے خیال آیا کہ قصاب سے اس دوستی کے بعد میرا فرض ہے کہ اوپر اس کی تیمارداری کے لئے جاؤں۔ شاید وہ سخت بیمار ہو۔ مجھے کچھ یہ بھی خیال تھا کہ رضیہ کے متعلق شاید اس سے کچھ خبر مل سکے اور اگر وہ یہیں ہو تو ممکن ہے اس کی جھلک ہی پا لوں۔ ڈاکٹر کو بتایا کہ میں بھی عمر قصاب کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں بھی اس کے ساتھ سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ قصاب کے ایک جھاڑی نما رشتہ دار نے ہمارے لئے دروازہ کھولا۔ سامنے کمرہ میں دیوار کے ساتھ چارپائی پہ پیٹھ کے بل ایک موٹی بے حس شکل پڑی ہوئی تھی ــــ ایک ڈرا دینے والی کپکپا دینے والی شکل میں کانپ سا گیا۔ اس شکل سے موت کی بو سی آتی تھی۔ مگر جب میں اس کے نزدیک پہنچا تو میں نے اس گھناؤنی خوفناک چیز کو دیکھا جس میں ملزائی قصاب مبدل ہو گیا تھا، اس کے ہولناک عارضہ نے اسے مسخ کر کے ایک غیر طبعی سی صورت دے دی تھی۔ جب میں نے اسے لی مارکیٹ کی دوکان پہ چہرے سے بکرے کا قیمہ بناتے دیکھا تھا تو اس وقت مجھے گمان نہ تھا کہ دس دن کے بعد وہ لحافوں اور پٹیوں میں بند لیٹی ہوئی یہ چیز بن جائے گا جو اب میرے سامنے پڑی تھی۔

ہمارے آنے پر اس نے آنکھیں کھولیں وہ ہوش میں تھا۔ اس کی بے رنگ آنکھوں میں شناخت کی روشنی آئی اور اس نے اپنی کہنیوں کے بل اوپر اٹھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر غریب محمد نے اسے پھر لٹا دیا، اس کا چہرہ جسم۔ ٹانگیں سب سوج گئی تھیں جیسے ان میں کسی نے ہوا بھر دی ہو اور یہ سوجن اس کو ایک عجیب لخلخت تاثر دے رہی تھی۔ یا اللہ

کراہتا اور اپنا سر ادھر اُدھر مارتا...... اب وہ کتنا قابلِ رحم تھا، کس قدر ہولناک!

جب ڈاکٹر غریب محمد اس پر سٹیتھو سکوپ لگانے اور بے معنی تسلی کے الفاظ کہنے میں مشغول تھا، میں نے اس موت کے کمرہ کا جائزہ لیا۔ نیچے ایک قالین تھا اور کونے میں ایک چھوٹی سی الماری جس میں ایک ریڈیو رکھا تھا۔ الماری میں کچھ اُردو کی کتابیں تھیں۔ دو تین ناول ایس۔ ایم جلال کے تھے اور ایک دو۔ مجر رفیق احمد کے رومانوں کے مجموعے بھی تھے۔ اس وقت اُردو ادب میں یہی دو مصنف لڑکیوں میں مقبول تھے اور ہر جگہ پڑھی ہوئی لڑکیاں ان ہی کے صفحات میں اپنے خوابوں کی تعبیر پاتی تھیں۔ یقیناً یہ رضیہ کی کتابیں تھیں کونے میں ایک تپائی پر ایک پیلی کاڑھا ہوا میز پوش تھا — کونوں پر پرندے اور پھول اور درمیان میں ایک قسم کا تاج محل..... سامنے دیوار پر ایک فریم شدہ انگریزی آرٹسٹ کی پینٹنگ تھی۔ کئی بچے سے کھلے ہوتے پھولوں میں کھیلتے ہوئے۔ رضیہ کا لمس اس کمرے میں ہر جگہ تھا اور یہ ایک قصاب کا کمرہ نہ تھا۔ یہ کسی بھی اچھے خوش حال تربیت یافتہ گھرانے کا کمرہ ہو سکتا تھا۔

عمر بولنے سے لاچار تھا۔ وہ بولنے کی کوشش کرتا اور پھر اپنے حلق کی طرف اشارہ کرتا۔ ایک دفعہ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے دبوچنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ اظہار کیا کہ اسے مجھے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے — جھاڑی نمار شتہ دار ڈاکٹر کو ایک طرف لے گیا اور میں نے ان کو دھیمے لہجہ میں باتیں کرتے سنا۔ ایک دفعہ رشتہ دار نے کہا۔ "اس کی لڑکی رضیہ حیدر آباد گئی ہے۔ اس کو تار دے دوں اور ایک دفعہ ڈاکٹر غریب محمد کی آواز "سوچنے کی بیماری ہے۔ یہ میں مرہم دے رہا ہوں کو کرتے رہو۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔ حالت کوئی تشویشناک نہیں" — اس سے مجھے پتہ لگا کہ رضیہ کا حیدر آباد جانا صحیح تھا۔ اور پروفیسر شاہسوار خاں نے کنارہ کو خواب میں جو اس کے محبوب کے متعلق معلومات دی تھیں بالکل درست تھیں۔ میں قطبوں کی طاقتوں کا قائل ہونے لگا.....

ڈاکٹر غریب محمد اور میں آدھ گھنٹے کے بعد قصاب کو اپنے رشتہ دار کے پاس چھوڑ کر نیچے اُتر آئے اور باہر گلی میں نکلتے ہی ڈاکٹر کا پہلا فقرہ یہ تھا "اقبال صاحب! وہ بھینس ضرور ان چوروں سے نکلوا دو۔ میں نے پچھلے ہی مہینہ اسے تین سو روپے میں خریدا تھا۔ تمہارا اثر رسوخ ہے۔۔۔ مگر گلی میں کھڑے ہوتے اور ڈاکٹر کی ڈھارس بندھاتے ہوئے میرے کان ایک آواز سن رہے تھے۔ عمر کے مکان کے سامنے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز۔ موت کا فرشتہ وہاں پھڑ پھڑا رہا تھا اور کچھ مایوس، اور کچھ خوف زدہ، میں وہاں سے سیدھا اور کہیں رکے بغیر بازار میں سے اللہ توکل راستوران کی امان میں لوٹ آیا۔"

اگلا دن میرے لئے بے حد مصروفیت کا تھا، مجھے راشن آفس میں کھانڈ اور آٹے پر پرمٹوں کے لئے درخواستیں دینا تھا اور آدھا دن میرا وہاں گذر گیا۔ میری غیر حاضری میں شیخ قربان علی کٹار بیکری، آیا تھا اور اس نے میرے لئے ایک پیغام چھوڑا تھا جو شداد دشتی نے مجھے دیا۔

" آپ کی غیر موجودگی میں شیخ قربان علی کٹار تشریف لائے تھے،" اس نے ایک مکمل مودبانہ لہجہ میں میرے لئے میز پر کھانا چنتے ہوئے کہا " اور انہوں نے فرمایا تھا کہ آپ سے کہہ دوں کہ آج عمل کا دن ہے اور یہ کہ آپ ان کی قیام گاہ پر شام کو ذرا جلد پہنچنے کی کوشش کریں کیونکہ انہیں چند ضروری باتوں پر بحث کرنا ہے۔"

" خوب،" میں اس بات پر خوش ہوا کہ اردو ادب کے دو ایک وقت کے بڑے ستونوں نے ایک دوسرے کو غالباً پہلی دفعہ دیکھ لیا ہے اور دشتی کا ردعمل اور تاثر جاننے کے لئے میں نے پوچھا " ان سے تمہاری کچھ باتیں ہوئیں۔"

" میں نے انہیں بتایا کہ میں شداد دشتی ہوں۔ مگر وہ بالکل کورے نظر آتے تھے۔ انہوں نے میرا نام نہ سنا تھا۔"

" شیخ قربان علی کٹار آج کل کچھ غائب دماغ رہتے ہیں۔ بعض زیادہ سنجیدہ چیزیں ان کے دماغ پر بوجھ بنی ہوئی ہیں۔"

" مجھے شیخ صاحب کا جگر خراب معلوم ہوتا ہے۔" اس نے مشفقانہ دلچسپی سے کہا۔

کو رقم کر رہا ہوں جو اس شام کو مجھے ڈل وے اسٹریٹ نے دیا اور کئی مختلف عنصروں کا اس میں ہاتھ ہو سکتا ہے۔ مرتے ہوئے قصاب کا طلسمی انگوٹھی پر اس تجربہ کا، پروفیسر شاہسوار خاں کی زبردست اور جناتی قوتوں کا، جن کا مجھے اب کافی ثبوت مل چکا تھا۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ اس شام ڈل وے اسٹریٹ میں کچھ غیر قدرتی کیفیت تھی، کوئی ایسی چیز جس پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی تھی اور جو وہاں تھی..... بعض وقت ایسا ہوتا ہے جیسا جانی پہچانی چیزیں بس ایک غیر مرئی لبادہ اوڑھ لیتی ہیں اور تبھی معلوم نہیں ہوتیں اور مجھے یقین ہے، پیارے پڑھنے والے، اگر تم ویسے ہی آدمی ہو جیسا میں تم کو سمجھتا ہوں۔ تو تم پر بھی ایسے لمحے آتے ہوں گے، جب اشیا نے اپنے مادی، زمینی لبادے اتار دیتے ہوں گے اور ننگی ہو گئی ہوں گی۔

جب کٹارنے میری دستک پر دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک اضطراب اور وحشت کی سی کیفیت تھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پیلا تھا۔ ویسے وہ اتنا ستھرا اور بنا ٹھنا تھا جیسا کہ میں نے اسے پہلے نہ دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے آج غسل کیا ہے یا کم از کم منہ اور بالوں کو صابون سے دھویا ہے، اس نے آج بالوں میں تیل لگا کر کنگھی بھی کی تھی اس کے بالوں میں مانگ نکالنے کی کوشش کے بھی آثار تھے۔ اس نے شیو بھی کیا تھا وہ میرا نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور میری بہترین امریکن ٹائی جس کی ملبی ملائم سطح پر ایک عورت کی تصویر تھی، باش، وہ لفظ ہے جس کا اس پر اطلاق ہو سکتا ہے۔

"چنگیزی یار! تم نے کچھ دیر کر دی!" اس نے آرام کرسی میں دراز ہوتے ہوئے کہا "اب وقت کیا ہے؟"

"میری گھڑی تمہاری کلائی پر بندھی ہے" میں نے اسے یاد دلایا۔

"اب ساڑھے آٹھ ہیں" اس نے مسافر کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا، نو بجے میں

انگوٹھی پر عمل کروں گا۔ میں نے ابھی تک اس گزارش کے الفاظ بھی نہیں چنے جو میں حضرت سلیمان کی بارگاہ میں عرض کروں گا۔ اسی لئے میں چاہتا تھا کہ تم جلدی آجاتے، تم اس ڈرافٹنگ وغیرہ میں کچھ اچھے ہو۔"

اس نے کمال فیاضی سے مجھے اپنی جیب میں سے کنگ سٹارک کا پیکٹ نکال کر مجھے ایک سگریٹ پیش کیا اس کے بعد اس نے جلدی سے پیکٹ کو جیب میں رکھ لیا یہ ہماری سہ سالہ دوستی کے دوران میں پہلا موقعہ تھا کہ شیخ قربان علی کٹار نے مجھے سگرٹ پیش کیا اور شاید آخری اس کا یہی فعل ظاہر کرتا تھا کہ اس کا موڈ میری طرف کتنا چکنا ہو رہا تھا اور یہ کہ اسے میرے تعاون کی کس قدر ضرورت تھی!

ایک اور چیز کٹار کے متعلق عجیب ہے یہ ہے کہ اگرچہ وہ تین چار دن میں دو سو تین سو صفحات کے ملیے ولولہ انگیز رومان ظاہراً بغیر کسی وقت کے یا دماغی دباؤ کے قلم بند کر سکتا ہے، اس کے لئے معمولی خط کا صحیح اور مناسب زبان میں لکھنا ایک بڑی دشواری کا کام ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں، اس کے زرخیز دماغ کی مشین میں جس نے اردو ادب کے لئے امام بخش اور نور حسین جیسے روسیاہ کردار تراشے ہیں اور حیرت خیز بھول بھلیوں والے وسیع تہ خانے تعمیر کئے ہیں، رکاوٹ آجاتی ہے، اس کا رواں دواں قلم جو پیر و نور حسین کے عشقیہ کارنامے کلو بیچا کرنے میں ایک لمحہ نہیں رکتا، جنبش کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ خط شاذ و نادر ہی لکھتا ہے اور چند ایک بار جب اسے مجبوراً لکھنے پڑے (مثلاً جب اس نے ایک دفعہ اپنے ماموں کو اس کے ہاں لڑکے کی پیدائش پر ایک تبریکی خط لکھا یا دو تین دفعہ مختلف فرموں کو نوکری کے لئے درخواست دی، تو میں نے اسے ان کی عبارت تیار کرنے میں مدد کی۔ اسے نہ صرف مختلف فرموں کو نوکری کے لئے درخواست دی) تو میں نے اسے ان کی عبارت تیار کرنے میں مدد کی۔ اسے نہ صرف مختلف، رشتے داروں اور منیجروں کے لئے خطوں کے

القاب ڈھونڈنے میں پریشانی ہوتی ہے (اس نے ایک دفعہ اپنے خط کا آغاز اس طرح کیا تھا۔ حضرت قبلہ عم محترم مدظلہ اللہ تعالیٰ) بلکہ اپنے مطالب کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ بھی وہ کبھی نہیں چن سکتا۔ ایسے موقعوں پر اسے چاروناچار اقبال حسین چنگیزی کی مدد لینی پڑتی ہے۔

ہم نے پندرہ منٹ اس بحث میں صرف کئے کہ اس گزارش کی لفظی شکل کیا ہونی چاہیئے جو قربان علی کتار حضرت سلیمان کی بارگاہ میں گزارے، حضرت سلیمان کا تخاطب کیا ہوگا اور کون سے القاب موزوں رہیں گے،

"خطاب کے لئے 'یور گریشس مجسٹی' موزوں رہے گا کیوں حضرت سلیمان جنات کے شہنشاہ ہیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔ کتار کچھ اس میں مشکوک تھا۔

"چنگیزی یار!" میں نہیں سمجھتا کہ حضرت سلیمان اور جن انگریزی سمجھ سکتے ہیں ہو سکتا ہے وہ انگریزی کے طرز خطاب کا برا مانیں اور اُسے گستاخی پر محمول کریں۔"

"باتیں کیا کر رہے ہو!" میں نے کہا، حضرت سلیمان کو انگریزی نہیں آتی ہوگی وہ تو پرندوں کی بولیاں تک سمجھ سکتے ہیں۔ پھر انگریزی اب ہمہ گیر زبان ہو گئی ہے مجھے یقین ہے کہ بہت سے جن وغیرہ اس زبان میں دسترس رکھتے ہوں گے۔ یہ بھی اغلب ہے کہ یہ وہاں دربار کی سرکاری زبان ہو!"

کتار نے ایک سمجھدار شخص کی طرح میری دلیل کی معقولیت کو مان لیا۔

"مگر۔۔" اس نے کہا "مجھے یہ یقین نہیں کہ انہیں یور مجسٹی کہا جائے یا یور ایکسلنسی"!

"یور ایکسلنسی کیوں؟"

"ممکن ہے عالم جنات جمہوریہ ہو۔ ری پبلک ہو۔"

"کیا مطلب!"

"مسلمان ہونے کی وجہ سے حضرت سلیمان کی حیثیت ایک جمہوریہ کے صدر کی ہوگی۔

اور صدر کے لئے موزوں خطاب یور ایکسلنسی ہے۔"

اس دفعہ میں نے کتار کی دلیل کے سامنے سر جھکایا۔
طرزِ خطاب کا تصفیہ کر کے میں فوراً آکسفورڈ ڈکشنری کے فلائی لیف پر اس عرضداشت کے الفاظ کا اردو میں ہی مسودہ تیار کرنے بیٹھ گیا۔ کتار کا انگریزی کا علم قدرے مشکوک تھا۔
"یور ایکسلنسی" میں نے لکھا" اور اس کے بعد میں اپنے قلم کی نوک چبانے لگا۔ واقعی یہ کوئی آسان کام نہ تھا اور پھر میں نے جو بھی دماغ میں آیا الل ٹپ لکھنا شروع کر دیا:

" یور ایکسلنسی، یہ ہیچمداں قربان علی کتار گوجرانوالوی جان کی امان پائے تو اپنے دل کا مدعا عرض کرے جیسا کہ یور ایکسلنسی کو غالباً معلوم ہی ہوگا۔ اس حقیر شخص کی محبوبہ سامنے کے مکان میں رہتی ہے جس کے فراق میں وہ دن بدن گھل رہا ہے۔ یور ایکسلنسی کو یہ سب بھی معلوم ہوگا کہ وہ عمر قصاب کی بیٹی ہے اور اب اپنی خالہ کے پاس حیدرآباد گئی ہوئی ہے۔ پچھلے چھ سات روز سے وہ اپنے ادنیٰ عاشق کی ترسی ہوئی آنکھوں کے سامنے نہیں آئی —
فی الواقع اس پر تقصیر کی صرف اتنی ہی گزارش ہے کہ آپ فغفور یا کسی اور مناسب جن کو جو متعلقہ محکمہ کا انچارج ہو حکم دیں کہ وہ اسی وقت ایسا انتظام کرے کہ رضیہ فوراً اسی وقت لوٹ آئے۔"

کتار کو اس بارے میں یقین نہ تھا کہ یہ گزارش ٹھیک ایسی ہی ہے جیسی کہ ہونی چاہیئے۔ مگر چونکہ اس کے پاس اس سے بہتر پیش کرنے کے لئے اور کچھ نہ تھا۔ اس نے اسے قبول کر لیا۔ صرف اس نے ایک اصلاح یہ دی کہ حیدرآباد دکن سے تمیز ہو جائے۔ اس کا خیال تھا کہ بعض جن شرارتاً ایسے احکام میں رخنہ پا کر ایسا عمل کرتے ہیں جن سے ظاہراً تو حکم کی تعمیل ہو جاتی ہو مگر دراصل مقصد تاویل اور شرارت ہو۔ اگر "سندھ" نہ لگایا جائے تو ممکن ہے کوئی اور رضیہ حیدرآباد دکن سے لوٹ آئے۔ میں نے حیدرآباد کے

آگے سنہ ہجری کا اضافہ کر دیا۔

نواب بجنے ہی والے تھے۔ شیخ قربان علی کنار باہر وضو کرنے کے لئے گیا.... اور میں دروازے میں سے قصاب کی بالکنی کی طرف دیکھنے لگا۔ سیاہ ٹاٹوں کے پیچھے اپنے کمرہ میں وہ اپنی ہولناک بیماری میں پھکتا اور سڑتا پڑا ہوگا، اس کے گرد اس کے چند اور جھاڑی نما رشتہ دار گدھوں کی طرح منڈلا رہے ہوں گے۔ میں کچھ تیورایا۔ پھر میں نے اس موت کے منظر کو اپنی نظروں سے موقوف کرتے ہوئے انگوٹھی پر عمل کے بارے میں سوچا۔ اب میں اس پر اور اس کے موجد پر نہیں ہنس سکتا تھا۔ کیا رخیہ فی الواقع لوٹ آئے گی! کیا ایسی چیزیں اس بیسویں صدی میں ممکن ہو سکتی ہیں ـــــ روحانیات ایک ایسی چیز ہے جس نے ہمیشہ مجھے حیران رکھا ہے اور جس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا..

کنار وضو کر کے کمرہ میں لوٹ آیا تھا۔ وہ خشوع وخضوع سے فرش پر اپنے بستر کی چادر بچھا کر قبلہ رو بیٹھ گیا..... میں اس کے سامنے اکڑوں ہو کر بیٹھ گیا آکسفورڈ ڈکشنری کو عرضداشت کے صفحے پر کھولے تاکہ وہ اس کو پڑھ سکے۔ کنار نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے طلسمی انگوٹھی کو اپنی جیب سے نکالا اور اس کے نگینے کو میری ٹائی سے پونچھ کر اسے اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی کے درمیان اس طرح پکڑا کہ نگینہ اس کی آنکھوں سے کوئی پانچ چھ انچ کے فاصلے پر تھا۔ اس نے مجھے دوبارہ بیچ میں نہ بولنے کی ہدایت کر کے نگینہ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا۔ پچھلے پندرہ دن میں پوری شدت سے ٹکٹکی باندھنے کی خوب مشق بہم پہنچائی تھی اور اس کی آنکھیں دھنسی ہوئی اور گہری، دو برموں کی طرح نگینے میں سوراخ کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ میں مانتا ہوں کہ میں ایک اضطرابی کیفیت میں تھا۔ میں متوقع نگاہوں سے کنار کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا..... مگر پانچ منٹ گزر گئے اور کچھ نہ ہوا۔ پروفیسر نشا جسوار خاں آخر ایک ڈھونگیا مکا رہی تھا۔ اپنے بھائی بندوں کی

کی طرح چار سو بیس۔

..... شیخ قربان علی کٹار کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ نگینے میں چیزیں دیکھ رہا تھا۔

"خاکروب کو بلاؤ" اس نے نگینے میں کسی کو حکم دیا، غالباً فغفور کو۔

اس نے اب غالباً میرے استفادہ اور اپنے مشاہدات کے تیقن کی خاطر سے، تیز تیز ان چیزوں کا ذکر کرنا شروع کیا جن کو وہ نگینے میں دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ تبصرہ کچھ کچھ پاکستان ریڈیو کی 'رننگ کمنٹری' کی طرح تھا جس میں تبصرہ گو اس قسم کے ارشادات سے نوازتا ہے۔

"اب وزیر اعظم ہوائی جہاز سے اترے ہیں، جنرل دلاور خاں نے ان کو سیلوٹ کیا۔ اب وزیر اعظم گورنر بہادر اور جنرل دلاور خاں کے درمیان گارڈ آف آنر کا معائنہ کرنے تشریف لے جا رہے ہیں۔ ان کا بیٹن گر گیا ہے۔ اب جنرل دلاور خاں اس کو اٹھا کر دے رہے ہیں۔ جنرل دلاور خاں جھکے ہوئے ہیں۔ وہ بیٹن اٹھانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اب وزیر اعظم کی خدمت میں اسے فوجی سیلوٹ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ اب وزیر اعظم پانچ حضرات کے ساتھ آگے آگے اس جگہ کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ جہاں میں کھڑا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

شیخ قربان علی کٹار کی رننگ کمنٹری اس طرح کی تھی۔ "نئے چھڑکاؤ کرو۔ سقہ اب چھڑکاؤ کر رہا ہے..... اب چار فراش آ رہے ہیں۔ وہ ایک دری اٹھائے ہوئے ہیں....... بچھاؤ بھئی دری! اب دری بچھ رہی ہے..... ایک فراش میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی شکل کچھ کچھ اس دودھ والے سے ملتی جلتی ہے جو یہاں دودھ لے کر آتا ہے..... پرے کونے پہ ایک تخت رکھا جا رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا جن اس پہ ایک زریں کرسی رکھ رہا ہے۔ فغفور! ــ یقیناً یہ فغفور ہے۔ وہ اب پلٹ کر میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے تخت کے گرد بہت سے لوگ لباس فاخرہ پہنے اور عصا اٹھائے جمع ہو رہے ہیں کچھ جنوا نات بھی ہیں ــــ ایک شیر اپنی پچھلی دو ٹانگوں پہ چلتا ہوا میری طرف آ رہا ہے۔ اور دُم سے آنسو پونچھ رہا ہے ــــ کیوں شیر روتے کیوں ہو! ایک دو منٹ اور، تنگور

تخت کے پاس کھڑے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں ـــــ

میں نے استعجاب کے مارے اُٹھ کر کنّار کے کندھے پر سے نگینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر میرے لئے افسوس یہ ایک نگینہ ہی تھا۔

"کوئی قرنا پھونک رہا ہے۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر ہو گئے۔ حیوانات اپنی اپنی جگہ پر۔ میں شیر کو پھر دیکھ رہا ہوں۔ اب کے چاروں پاؤں کے بل چل رہا ہے۔ پرند بھی ہیں، ایک فاختہ مڑ کر میری طرف دیکھ رہی ہے۔ گھو! گھو! گھو فاختہ گھو! گھو! چوبدار دمکتے عجیب لباس پہنے داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے جھرمٹ میں سر پر سنہری تاج پہنے اور ایک بیش قیمت خلعت میں ایک شخص ہے۔ وہ شخص اب تخت پر روپہلی کرسی پر بیٹھ گیا ہے منہ میری طرف کئے۔ وہ مجھے دیکھ رہا ہے ـــ یہ حضرت سلیمان ہیں۔ ۔ شیر اب پھر اپنی پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا ہے اور دُم سے آنسو پونچھ رہا ہے۔ غالباً معتوب جن ہے۔ حضرت سلیمان میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ اب میں درخواست گزارنے لگا ہوں۔ کتاب ذرا اُوپر کرو۔"

میں نے ڈکشنری کو اوپر اس کی نگاہوں کے نیچے اُٹھایا اور اس نے ایک کانپتی ہوئی۔ لرزاں آواز میں اس پر لکھی ہوئی گزارش کو پڑھنا شروع کیا "حضور والا، یور ایکسلنسی اور آخر تک۔ اس نے اب کاغذ کے حروف سے نظر اُٹھا کر پھر نگینے میں نظر ڈالی "اب تو یہاں کچھ نہیں ہے۔ یور ایکسلنسی! یور ایکسلنسی!"

... مگر گلی میں نیچے ایک گھوڑے کی ٹاپ اور ایک وکٹوریہ کے اچانک آ رکنے کی آواز سی آئی، کنّار نے بھی اسے سُنا، ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں کے دماغ میں ایک ہی خیال تھا۔ کنّار جلدی سے انگوٹھی کو جیب میں ڈال کر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہم باہر بالکنی کو دوڑے۔ نیچے قصاب کے مکان کے سامنے ایک وکٹوریہ کھڑی تھی۔ چاکی واڑا کی مبتذل ترین اور فرتوت ترین گاڑیوں میں سے ایک، اور گلی کی تاریکی

میں اس کی ہوا میں بھڑکتی ہوئی سامنے کی دو لالٹینیں ایک پیلا سبھی سا تاثر دے رہی تھیں ان کے درمیان کوچ بکس پر ایک بے حد زرد رو ابھری ہوئی کنپٹیوں والا ایک چھوٹا سا شخص بیٹھا تھا ـــ اس شخص کا چہرہ ایک غیر زمینی سی ہریالی سے عجیب طرح مسخ شدہ اور مڑا ہوا ایک لحظ کے لئے صرف ایک لحظ کے لئے مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھیں کھڑی ہوئی تھیں ... کملا نے ایک خوف و ہراس میں اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے بازو کو مضبوطی سے پکڑا۔ وہ مجھے یہ جبر بتانا چاہتا تھا کہ کوچبان کی آنکھیں کھڑی تھیں مگر دہشت یا اضطراب نے اس سے طاقت گویائی چھین لی تھی.....

..... وکٹوریہ میں سے پرلی طرف دو سفید برقعہ پوش عورتیں نکلیں۔ ان میں سے ایک بالکل رضیہ کی قد و قامت کی تھی اور دوسرے لمحہ جب وہ پہلی لالٹین کے سامنے اپنے پرس میں سے سفید دمکتی ہوئی انگلیوں سے وکٹوریہ والے کو پیسے دینے کے لئے کھڑی تھی تو اس نے اپنا نقاب الٹا وہ وہی سفید دیوی تھی۔ وہ رضیہ تھی!

دوسری عورت قد و قامت میں چھوٹی تھی اور کسی قدر چوڑی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ رضیہ کی حیدرآباد والی خالہ تھی۔ وہ دونوں عورتیں سیڑھیوں پر چڑھ گئیں اور پچھاڑی بنارسنہ دار سامان اٹھا کر ان کے پیچھے گیا۔ وہی رشتہ دار جسے اگلے روز کل عمر کے گرد منڈلاتے دیکھا تھا۔

...... اب تو میں نے وکٹوریا والے کو بھی پہچان لیا۔ میں نے اس کو کئی بار جاکی واڑا کے مختلف مقامات میں اپنی بوسیدہ گاڑی کو بے مقصد کاموں کے لئے ہانکتے ہوئے پایا تھا۔ وہ جاکی واڑا کی ایک آشنا صورت تھا۔ اگرچہ میں نے اس کی تبذل گاڑی میں سوار ہونے کی کبھی ہمت نہ کی تھی۔ کچھ تو گاڑی کی بھیانک شکل کی وجہ سے اور کچھ اس کے اپنے چہرے کی کریہہ بدصورتی کی وجہ سے۔ ایسی گاڑی میں کسی آدمی کے ساتھ کچھ بھی واقعہ ہو سکتا تھا۔ کسی گلی کے نکڑ پہ اس کا گلا کاٹا جا سکتا تھا یا اسے لوٹا جا سکتا تھا۔ مگر میں

اس معجزے سے بالکل متحیر ہو گیا تھا.... انگوٹھی ڈھونگ نہ تھی! پروفیسر شاہسوار خاں ڈھونگ نہ تھا — ایک خواہش کے فوراً ڈرامائی انداز میں حقیقت میں بتدل ہو جانے سے مجھے لڑکھڑا دیا.....

وکٹوریہ مڑ کر گلی میں واپس جانے لگی۔ شیخ قربان علی کتار نے مجھے ایک فتحمندانہ اور دیوانہ خوشی کی نگاہ سے دیکھا جس کا انداز مجھے نہ بھایا۔ یہ ایک پاگل آدمی کی نظر تھی۔ ایک ایسا انسان جو چڑیلوں کی گرفت میں ہو اور اس دنیا کا نہ ہو۔

"وہ آگئی ہے۔ وہ آگئی ہے" وہ چلایا "میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ شاہسوار خاں کی ایجاد سب مشکلات حل کر دے گی۔ وہ حقیقی قطبوں کا بادشاہ ہے کل......"

لیکن اسی وقت سامنے عمر کے فلیٹ پر سے یک لخت عورتوں کے رونے کی ایک دل دہلا دینے والی آواز آئی.... وہ آواز جو کسی گھر میں موت کا اعلان ہوتی ہے...... میرا کلیجہ ہل سا گیا اور کوئی غیر مرئی آواز سی میرے کان میں بار بار دہرانے لگی "قصاب مر گیا ہے۔ قصاب مر گیا ہے۔ قصاب مر گیا ہے".... مرگ میں انسان کے کان غلطی نہیں کھا سکتے.... میں بالکنی پہ آیا۔ انہوں نے اب دروازہ کھول دیا تھا اور تانوں کے سوراخوں میں سے منور کمرے میں سے ایک سفید انسانی شکل کو گھٹنوں پہ چارپائی پہ لیٹی ہوئی شکل پہ اوندھے پڑے دیکھ رہا تھا — ہچکیاں اور سسکیاں اپنے پیاری رضیہ.... اس کمرے میں دو تین اور شکلیں موت کی چال سے چل رہی تھیں۔

"یہ رونا کیسا ہے" شیخ قربان علی کتار نے میرے پاس بالکنی پہ آتے ہوئے کہا۔ اسے رضیہ کے باپ کی بیماری کے متعلق میں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

"رضیہ کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

اس نے مجھے اس طرح قہر آلود نظروں سے دیکھا جیسے میں مذاق کر رہا ہوں۔ خواہ وہ کتنا ہی اپنی محبوب کے والد سے نفرت کرتا تھا، وہ اس کے مرجانے سے خوش نہ تھا۔

"تم مذاق کر رہے ہو۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ رونے کی آواز رضیہ کے مکان سے ہی آ رہی ہے؟"

میں نے اسے سمجھایا کہ میں مذاق نہیں کر رہا تھا اور اس پر واضح کیا کہ رضیہ کا باپ درا صل عرصہ سے معدہ کے سرطان کے مرض میں مبتلا تھا اور کل جب میں اس کی تیمارداری کے لئے گیا تو اس کی حالت بے حد خطرناک اور تشویشناک تھی اور اس کا رشتہ دار رضیہ کو حیدرآباد سے بذریعہ تار بلوانے کو سوچ رہا تھا۔

وہ کچھ عرصہ تک خاموش کھڑا ٹانگوں کے پیچھے منور مستطیل کی طرف دیکھتا رہا۔

"رضیہ کو اس سے بے حد صدمہ ہوگا۔ چنگیزی یار،" اس نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے ہمیں اس وقت کچھ کرنا چاہیئے۔"

"ہم صبح کو اس کے جنازے میں شریک ہو سکتے ہیں" میں نے کلبی انداز میں کہا "یہ ہے جو ہم کر سکتے ہیں" اور میں بالکنی سے واپس کمرے کی طرف مڑا۔ میں اپنی آنکھوں سے اُمڈتے ہوئے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اگرچہ میں کلبی اور سنکی ہوں۔ میرا دل ایک کمزور عورت کا دل ہے۔

اس رات مجھے ایک پل نیند نہ آئی۔ کمرانی عمر میرے لئے سوائے ایک معمولی واقف کار کے اور کچھ نہ تھا۔ مگر اس کی موت میرے لئے ایک کافی صدمہ کا موجب ہوئی۔ میں نے اس کو لی مارکیٹ میں اپنی دوکان کے پاس کھڑے ہوئے دیکھا۔ بھاری اور دیوہیکل اور پراعتماد پھر میں نے اسے مڈل وے اسٹریٹ میں اپنے فلیٹ پہ چارپائی پہ پڑے ہوئے دیکھا۔ ایک سُوجا ہوا پھولا ہوا کریہہ انسانی گودا..... کل سویرے وہ چاکی واڑا کے قبرستان میں دس گز مٹی کے نیچے لیٹا ہوگا۔ میں اس کو اب کبھی نہ دیکھوں گا..... اور میں نے اپنے آپ کو اس کے مالی حالات کے بارے میں فکر کرتے ہوئے پایا۔ کیا اس نے رضیہ کے لئے کافی روپیہ چھوڑا تھا۔ رضیہ کی اب دیکھ بھال کون کرے گا؟ کیا وہی چھچھے دار بے شمار رشتہ دار جسے میں نے اس شام عمر کے پاس دیکھا تھا۔ اس شام بھی مجھے اس کا طور اور شکل نہ بھائے تھے۔ وہ مجھے اس قسم کا رشتہ دار معلوم ہوا تھا جو تمہیں کبھی ساری عمر شکل نہیں دکھاتے مگر جب تم بستر مرگ پہ ہو تو وہ ہمیشہ تمہارے گرد آموجود ہوتے ہیں اور خاتمہ کو تیز تر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ رضیہ کو اس آدمی سے بچانا چاہئے..... مگر میں اس طرح فکر کیوں کر رہا ہوں۔ آخر عمر میرا ایک اتفاقیہ واقف کار ہی تو تھا جس سے میں صرف تین دفعہ ملا تھا!

دوسری صبح منہ اندھیرے ہی تیار ہوا اور رشدا دیشمی کو ساتھ لے کر میں مڈل وے اسٹریٹ میں مرحوم کے مکان پر گیا۔ ابھی ماتمی جمع نہ ہوئے تھے اور دراصل ابھی بہت

سویرا تھا۔ میں نے سیڑھیاں چڑھ کر کنڈی کھٹکھٹائی اسی رشتہ دار نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا کہ میں مرحوم کا دوست ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ اگر تجہیز و تکفین میں میری مدد کی ضرورت ہو تو آپ کا ہاتھ بٹاؤں۔ اس نے مجھے ایک مدافعانہ سی نگاہ سے دیکھا جیسے وہ میری درخواست کا مطلب نہ سمجھتا ہو، مگر اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔ "آؤ بیٹا اندر آجاؤ۔۔۔ بیٹی رضیہ تم ذرا اندر آجاؤ۔" رشتہ دار نے رستہ نہ چھوڑا مگر، ہم ایک طرف سے اندر چلے گئے۔ مردہ قصاب اپنی چارپائی پر پڑا تھا۔ سفید چادر اس پہ تنی ہوئی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے جو اپنی چالیس سال عمر کے باوجود اب تک ایک پروقار طریق پہ خوبصورت تھی اور جس کے نقوش کے تیکھے پن میں رضیہ کی جھلک تھی، ہمیں اس کی موت کی تھوڑی بہت روئداد سنائی، روتے ہوتے اس نے کہا "بیٹا! عمر کے ہوتے میری رضیہ راج کرتی تھی۔ عمر تجھے بھی حیدرآباد میں پچاس روپے ماہوار دیتا تھا۔ اب ہم لٹ گئے،" مگر فوراً ہی بعد وہ ضروری اور فوری معاملات پہ آگئیں جن کو ابھی طے کرنا تھا۔

رضیہ دوسرے کمرے میں پردوں کے پیچھے تھی۔۔۔۔ اور ایک دفعہ میں نے اس کو سوجی ہوئی آنکھوں سے پردے کے پیچھے سے جھانکتے پایا، مگر میری نگاہ کے ادھر پڑتے ہی صرف پردے، ہی تھے جو سرسراتے اور لہروں کی طرح ہلتے رہ گئے۔ ہم نے بوڑھی خالہ سے ہدایات لیں (اس میں بچاس سے شیخ قربان علی کناروں جتنی دنیاوی سمجھ بوجھ تھی) اور پھر ہم اس کو چھوڑ کر تجہیز و تکفین کے انتظام میں لگ گئے۔ سامنے کی حویلی کے آنگن میں آنے والے ماتمیوں کے لئے ایک دری بچھا دی گئی اور میں نے چھتے دار رشتہ دار سے کہا کہ وہ وہاں بیٹھے اور ماتمیوں کو بٹھائے۔ شنداد بیٹمی کو میں نے برابینڈ کے قبرستان کی طرف قبر کھدوانے کا انتظام کرنے کے لئے بھیجا (اس نے مجھے بتایا کہ وہ کچھ عرصہ گورکن بھی رہ چکا ہے) اور میں خود غسال اور درزی کی تلاش میں بھاگا۔ قبرستان یہاں سے چار میل دور تھا اور جنازہ کا بھی انتظام کرنا تھا۔

اور تب میں نے چند حیرت انگیز دریافتیں کیں۔ اس شہر میں کسی آدمی کی تجہیز و تکفین کوئی آسان کام نہیں۔ اس بیس لاکھ کے شہر میں نہ غسال ہیں نہ کفن ساز کم از کم یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ تم ان کو کہاں ڈھونڈ سکتے ہو۔ ویسے یہاں کئی ایک انجمنیں ہیں جو مردوں کو ٹھکانے لگانے کا سب انتظام کرتی ہیں مثلاً میمن جنازہ انجمن ہے، جو صرف میمنوں کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ دار ہے۔ شیخ سوگواران انجمن ہے جو صرف شیخوں کا بندوبست کرتی ہے۔ بوہرہ ماتمی انجمن جو صرف بوہروں کو دھوتی اور دفناتی ہے۔ دوسری کئی انجمنیں ہیں مگر وہ صرف ممبروں کے لیے ہیں اور ممبروں کے علاوہ دوسروں کو ہاتھ نہیں لگاتیں مجھے ان حیرت انگیز باتوں کا علم نہ تھا۔۔۔۔ آخر بڑی بھاگ دوڑ کے بعد میمن جنازہ انجمن کے سیکرٹری نے مجھ سے ساٹھ روپے پیشگی رکھوا کر میرے ساتھ دو مولوی اور ایک غسال ٹرک میں روانہ کئے، مگر سیکرٹری نے مجھ پر وضاحت کر دی کہ انجمن ایسے خلاف وضع امور کی اجازت نہیں دیتی (ان کا پورا بل ایک سو بیس روپے کا مجھے جنازہ کے بعد پیش کیا گیا)۔۔۔۔

قصہ مختصر کوئی گیارہ بجے ہم عمر مرحوم کے تابوت کو ٹرک میں ڈال کر پیرابینڈ کے قبرستان پر لے گئے۔ جہاں ہم نے اسے ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کیا، مرحوم عمر کے جنازہ میں لی مارکیٹ کے سب قصاب شریک تھے اور یتیموں کی تعداد کافی تھی اور ان میں سے کئی فی الواقع غمزدہ معلوم ہوتے تھے جیسے یہ ان کا ذاتی نقصان ہو۔

جمعہ کا روز تھا جس دن رضیہ کا باپ ہمیشہ کے لئے اپنی پیاری بیٹی رضیہ کو تن تنہا چھوڑ کر پیرابینڈ کے قبرستان میں جا بسا اور اسی رات شیخ قربان علی کنار کو خواب میں سفید گھوڑے پر سوار پروفیسر شاہسوار خاں ملا اس نے کنار سے کہا کہ قصاب کے کلنٹے کو راستہ سے ہٹانے کی ذمہ داری اسی (شاہسوار) پر ہے اور اب محبوب کا وصال (انشاءاللہ) بعید نہیں۔ اس نے کنار کو اس بات کی یاد دہانی بھی کرائی کہ اس کو ابھی تک پچیس روپے آٹھ آنے کا منی آرڈر وصول نہیں ہوا۔

اگلے بارہ دن کے ان واقعات کے رقم کرنے کے لئے جن کا اس رومان سے براہ راست کچھ واسطہ ہے مجھے اپنا مفصل کرانیکل ٹھیپ رکھنا پڑے گا۔ ورنہ شاید یہ رومان کبھی ختم نہ ہو۔ جب تک وہ کرانیکل میرے سامنے میرے لکھنے والے ڈیسک پہ رہتا ہے۔ میں اس سے حوالہ کرنے کی (اور اس سے صفحات کے صفحات نقل کرنے کی) ترغیب کی مزاحمت نہیں کر سکتا۔۔۔ مجھ میں حسِ انتخاب کا مکمل فقدان ہے۔ ذاتی طور پر میں ڈبلیو شکسپیر کے مقبول مقولے، اختصار بیان کی جان ہے، کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا۔ مگر میرے ایک دوست نے جسے میں نے صفحات پڑھنے کے لئے دیئے ہیں، رائے دی ہے کہ میرے اس تفصیلی طریقۂ کار میں کئی خطرے ہیں وہ کہتا ہے کہ غیر ضروری باتیں لکھنا بڑا فن ہے اور اس سے رومان کے اصل مقصد کے کھو جانے کا امکان ہے۔ شاید وہ ٹھیک کہتا ہے۔ میں نہیں جانتا! مگر اس کی رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے (کیونکہ وہ ایک عقلمند سلجھا ہوا شخص ہے اور فن کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے) میں اب اپنے حافظے سے اجمالاً لکھوں گا اور صرف آخری باب کے لئے پھر اپنے کرانیکل کے صفحات کی طرف رجوع کروں گا — اور اسی لئے وہ مواد جو میرے کرانیکل میں دو سو صفحات میں بکھرا ہوا ہے یہاں تین چار صفحات میں دیا جاتا ہے — دریا کو ایک کوزے میں بند کرتے ہوئے۔

جب کلارس نے مجھے دوبارہ پچیس روپے آٹھ آنے اودھار دینے کے لئے کہا تا کہ وہ پروفیسر شامسوار خاں کے حکم کی تعمیل میں یہ رقم پروفیسر کو منی آرڈر کر سکے، میں نے اسے

بمشکل سمجھایا کہ پروفیسر کے تیسری دفعہ خواب میں ظہور کا انتظار کرے اور اگر پھر بھی اس نے منی آرڈر بھیجے جانے پر اصرار کیا تو میں اسے روپیہ دے دوں گا۔ کٹار نے حسب معمول مجھے سچی دوستی کی قسم دی اور جتایا کہ میں چاندی کے چند حقیر ٹکڑوں کے عوض اس کی بنی بنائی ہوئی بات کو بگاڑنے پر تُلا ہوا ہوں مگر میں نے اس کی شکایت کو دوسرے کان سے اُڑا دیا۔ بات یہ ہے کہ اس وقت میری اقتصادی حالت اتنی اچھی نہ تھی اور حقیقتاً میں رقم اسے دینے سے قاصر تھا۔

میں لوگوں کے دلوں کے بھید جاننے کا دعویدار نہیں ہوں مگر میرا خیال ہے کہ میں ان خیالات کی نوعیت کو صحیح طور سے بھانپنے پر قادر ہوں جو شیخ قربان علی کٹار کے دل میں سے بلکہ اس کے تحت الشعور میں سے گزرتے ہیں۔ نابرادہ ہمیشہ رضیہ کے باپ کے گزر جانے پر غم کا اور افسوس کا اظہار کرتا تھا در اصل اس موت پر اس کے دل میں ایک گونہ اطمینان اور خوشی تھی۔ قصاب ہمیشہ اسے اپنی منزل کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ لگتا تھا اور اس کا خیال ہی اس پر رات کو سرد کپکپا ہٹیں طاری کرنے کے لئے کافی تھا۔ اب وہ بڑی رکاوٹ اس کے راستے سے ہٹ گئی تھی۔ (پروفیسر شاہسوار خاں کا بھی یہی خیال تھا کہ قصاب کا وجود ایک رکاوٹ تھا) اور وہ سڑک جس کے خاتمہ پر اسے رضیہ کھڑی نظر آرہی تھی، اب صاف، اور سفر کے لئے سہل تھی۔۔۔۔ انگوٹھی کے اعجاز کی وجہ سے اس میں جسارت آگئی تھی، اس کی خود اعتمادی بڑھ گئی تھی۔ اسے یہ بھی ڈھارس تھی کہ وہ منزل کا سفر کرنے کے لئے اکیلا نہیں اور یہ کہ پروفیسر شاہسوار خاں خود اس کی کامیابی کے لئے تگ ودو کر رہا ہے۔۔۔۔۔

جہاں تک رکاوٹ دور ہو جانے کا تعلق تھا، میری نظر میں حالات پہلے سے بہتر ہوئے تھے۔ رضیہ کی خالہ نے عمر کے مرنے کے بعد سب کچھ مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا تھا۔ وہ دنیاوی طور پر ہوشیار اور معاملہ فہم عورت تھی اور ان دنوں میں اس سے

کئی بار ملا (کنّارہ کو اس کا کچھ علم نہ تھا)۔ وہ مجھے بیٹا کہتی تھی اور ایک طرح اس کے دل میں میرے لئے ایک قسم کی چاہت پیدا ہو گئی تھی۔ جب رضیہ دوسرے کمرے میں ہوتی (سرسراتے ہوئے پردے موجوں کی طرح) تو وہ مجھ سے کھلم کھلا مرحوم عمر کے مالی اور خانگی معاملات پر اس طرح باتیں کرتی جیسے کوئی اپنے عزیز سے کرتا ہے اسی سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ چہیتے دار رشتہ دار مرحوم کے ایک متوفی بھائی کا لڑکا ہے جس نے مرحوم کی ساری آبائی جائداد بھی ہڑپ کر لی تھی اور اب یہ شخص مرحوم کی لی مارکیٹ کی دوکان کے پیچھے پڑا تھا۔ اس نے دیدہ دلیری سے خالہ سے رضیہ کے لئے رشتہ بھی مانگا تھا۔

"میں نے اس سے کہہ دیا ہے۔ جا اپنا منہ شیشے میں دیکھ۔ میری رضیہ تیرے جیسے جانگلیوں کے لئے نہیں پیدا ہوئی ہے؟"

میں نے رضیہ کی خالہ کو کئی ایک گھریلو معاملات کے سلجھانے میں مدد دی 'عمر قصاب' فراخ اور کھلی طبیعت کا مالک ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اچھا کماتا بیتا رہا تھا جو کچھ تھوڑا بہت اس نے پس انداز کیا تھا وہ اس کی علالت پر اور رضیہ کے جہیز بنانے پر خرچ ہو گیا تھا (خالہ نے مجھ پر یہاں ایک پرمعنی نگاہ ڈالی)۔۔۔۔ ان کو خرچ کی وجہ سے تنگی تھی میں نے خالہ کی درخواست پر مرحوم عمر کی وہ دوکان ایک معتد بہ رقم پہ فروخت کرادی میں اس کے مکان پر ہی تھا جب اس جونک سے رشتہ دار کو آخری دفعہ دروازہ دکھایا گیا تھا۔

ذائڈ پرست غالباً کہیں گے کہ میں نے اس ادھیڑ عمر عورت کے لئے یہ محبت بھرا تردد اور عمر مرحوم کے گھرانے کے مالی معاملات کو سلجھانے میں بھاگ دوڑ اس لئے کی تھی کہ میرے تحت الشعور میں رضیہ ایک گونہ کشش رکھتی تھی۔ فرائڈ کی اصطلاح میں جنسی کشش ——— اور غالباً ٹھیک نہیں۔ ممکن ہے ایسی خواہش میرے تحت الشعور میں ہو مگر میں اس سے آگاہ نہ تھا۔ ہاں ہنوز۔ تھا کہ جب میں اس کی خالہ کے مکان پہ جا کر کنڈی کھٹکھٹاتا میرا دل

کچھ دھڑکنے لگتا اور ایک گرم سی لہر میرے سارے جسم میں سرایت کرنے لگتی۔ بعض دفعہ جب اس کی خالہ باتوں باتوں میں رضیہ کا نام لیتی تو میں شرما جاتا، کچھ پریشان سا ہو جاتا.....

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ استعجاب کے لئے میں نے کوتے میں کتابوں کی الماری میں کتابوں کو دیکھنا شروع کیا۔ کچھ اس لئے کہ میری پرانی عادت ہے، اور کچھ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ رضیہ کا مطالعہ میں مذاق کیا ہے۔ مجھے ان میں کنار کا ایک ۱۹۱۲ء کا چھپا ہوا ناول بے مثال چمگاڈر، مل گیا۔ اس کے ذرا کم مشہور ناولوں میں سے ایک اور جو آج کل نایاب ہے رضیہ نے اس کو چار سال پہلے کسی اسٹیشن کے بک شال سے خریدا ہوگا۔ ٹائیٹل مجلد باتصویر تھا اور کنار کے سب ناولوں کے ٹائیٹلوں کی طرح بے مدمذاقانہ اور بھونڈا۔ میں اس کو فحش کے لفظ سے بیان کر سکتا ہوں اگرچہ یہ اس لفظ کے عام معنی کے لحاظ میں فحش نہ تھا۔ نہیں! نہیں۔ ٹائیٹل پر حسینہ کی تصویر برہنہ نہ تھی۔ تم اس کے سینے کے کوہستان اور اس کے لنگے کو ران کے اوپر سے پھٹا ہوا دیکھ سکتے تھے۔ مگر وہ حسینہ برہنہ نہ تھی۔ وہ ایک کافی فربہ اور موٹے نقوش کی حسینہ تھی اور وہ ایک بڑے بھونڈے رنگین مصنوعی باغ میں ایک فوارے کی منڈیر پر بیٹھی اوپر ایک بہت بڑے چمگادڑ کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے تک رہی تھی جو ہوا میں سیدھی معلق تھی۔ یہی وہ بے مثال چمگاڈر تھی.....

کنار کے سب ناولوں کے ٹائیٹل ایسے ہی عامیانہ اور بھونڈے فحش ہوتے تھے۔ اور گو اندر کا مواد ایسے ٹائیٹل کا ہی حقدار ہوتا تھا۔ کنار نے ان ٹائیٹلوں کے موبزائن میں کبھی ان کی بھونڈے پن کو نوٹ نہیں کیا اور حقیقتاً اس نے ہمیشہ ان کو دیدہ زیب اور آرٹسٹک پایا۔

میں نے بے مثال چمگاڈر نہیں پڑھی مگر غالباً یہ کنار کے دوسرے پچاس ناولوں سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ پیارے پڑھنے والے، تم شاید سوچو گے کہ رضیہ کنار کے ناول پڑھنے کی وجہ سے بڑی بدمذاق اور عام لڑکی ہوگی اور یہ کہ کوئی اچھی سلجھی ہوئی

لڑکی ایسی کتاب کو چھو نہیں سکتی۔۔۔ تم ٹھیک ہو۔ ان دنوں کٹار کے ناول ہمارے گھروں میں چوری چھپے آنے لگے تھے اور لڑکیوں نے ان کو بے حد دلچسپی اور مسرت سے پڑھا مگر میرا خیال نہیں کہ ان ناولوں نے ان کو کوئی بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ کوئی لڑکی جو کٹار کے یا ایس ایم اجلال کے ناول پڑھتی ہے تم اس کے متعلق ایک بات کے بارے میں پر یقین ہو سکتے ہو، کہ وہ ایک زندگی سے تلملاتی ہوئی اور رومان انگیز لڑکی ہے یہ بات کہ اسے اپنے تخیل کی خوراک کے لئے کٹار یا ایس ایم اجلال پر قانع ہونا پڑتا ہے، اس کا قصور نہیں بلکہ ہمارے ادب کی کم مائگی کا قصور ہے جس میں اس ادب کی خاص صنف میں کٹار اور اجلال سے بہتر ناول نویس ہیں ہی نہیں میری رائے میں ایک مخرب اخلاق کتاب۔ جو حقیقتاً مخرب اخلاق ہو۔ ہماری لڑکیوں کو بے اندازہ فائدہ پہنچا سکتی ہے اور ذاتی طور سے میں اس لڑکی کو جو کٹار کی شائق ہے، اس لڑکی پر کہیں ترجیح دوں گا۔ جو صرف راشد الخیری اور ڈاکٹر نذیر احمد کو پڑھتی رہی ہے۔ موخر الذکر لڑکی میرے نزدیک بے حد قابل رحم ہے اور اس سے بڑی بدقسمت اور کونسی لڑکی ہو سکتی ہے جس کی زندگی اور خیالات کی تشکیل اُن دو قابل تعظیم مگر ناقابل برداشت بوڑھوں نے کی ہو۔

"کتاب میرے دوست کی لکھی ہوئی ہے،" میں نے بلند لہجہ میں رضیہ کی خالہ کو بتایا۔ مجھے یقین تھا کہ برآمدے کے پردوں کے پیچھے رضیہ کھڑی سن رہی تھی۔

"یہ تصویر تو بڑی بے ہودہ ہے۔ رضیہ یہ کتابیں پتہ نہیں کہاں سے اکٹھی کرتی ہیں۔ میں ان کو آگ لگا دوں گی۔ یہ نیک لڑکیوں کے پڑھنے کی نہیں،" خالہ کا جواب تھا۔

میں نے شرمندہ ہو کر کہا "یہ میرے دوست شیخ قربان علی کٹار کی ہے۔ وہ اس سامنے کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ میں اسی کے پاس شام کو آتا ہوں،" میری نظر نہ آنے والی مخاطب رضیہ تھی۔

"کون وہ سامنے والا سوکھا سڑا آدمی تو نہیں۔ وہ ہمیشہ آرام کرسی پہ آگے جھکا ہوا

اس کی طرف بھیگی بھیگی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں اسے یہاں کیا نظر آتا ہے۔
اقبال بیٹا اس کو سمجھا دینا کہ یہ ٹھیک نہیں۔،،

اگر میں کسی لڑکی کی نفسیات کو صحیح سمجھتا ہوں، تو میری رائے میں اسے اپنے چہیتے مرد مصنف سے جو اس کی رومانوں کی دنیا آباد کرتا ہے۔ایک دھڑکا دینے والی والہانہ عقیدت ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک لڑکی ہوتا تو کسی اور مرد کی بہ نسبت اپنے چہیتے مرد مصنف کے ساتھ بھاگ جانے کو ترجیح دیتا۔ میری رائے میں ہمارے وہ مصنف جنہیں لڑکیاں پڑھتی ہیں، اگر باہمت ہوں تو لاتعداد عورتوں کو ان کی رضا سے بھگا سکتے ہیں۔ وہ شخص اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں یا وہ اپنے سنہری موقع کو کھو رہے ہیں۔ ان کا ادھیڑ عمر کا ہونا یا گنجا ہونا بھی ان کی اس کامیابی میں رکاوٹ نہیں وہ اپنے ہیروؤں اور کرداروں کی آدھی جرات اور ہمت سے ہی کام لیں تو ان کی زندگی بڑی سنسنی خیز اور رومان پرور بن سکتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد رضیہ نے فلیٹ نمبر دس کے مکین میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔ میرے بعد اس کی بالکنی کے ٹاٹ کو نے سے ذرا سرک گئے اور ان کے درمیان شگاف اب فراخ تر ہو گیا۔۔۔ میں نے اپنے آپ کو ڈھارس بندھائی کہ رضیہ کی یہ دلچسپی عارضی ہے میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے کمار کی اس خوش نصیبی پر تھوڑا سا حسد محسوس کیا۔۔۔ کاش میں نے بے مثال جم کا ڈر تصنیف کی ہوتی میں نے کمار سے اپنے رضیہ کے گھر پر جانے اور اس کی خالہ سے اپنی راہ و رسم کا حال چھپا رکھا تھا اگرچہ بہت تھوڑی باتیں ہیں جنہیں میں کسی سے چھپاتا ہوں۔ اگر وہ اتنا غیر حاضر دماغ اور کوتاہ نگاہ نہ ہوتا تو وہ یقیناً خود ہی مجھے رضیہ کے مکان کی سیڑھیوں پر اترتے چڑھتے ہوئے پکڑ لیتا۔۔۔۔۔

اس کی امیدوں کا گراف اب اتنا اوپر چڑھ گیا تھا جتنا او پنچا وہ پہلے نہ چڑھا

تھا۔ وہ ان دنوں ہمیشہ کوٹ اور ٹائی میں رہتا، آکسفورڈ ڈکشنری ہمیشہ کھلی رہتی (اسے اب وہ اس کی ضرورت نہ سمجھتا تھا) اور ان نظروں میں جو وہ عمر مرحوم کے فلیٹ کی طرف اس وقت پھینکتا جب رضیہ وہاں نہ کھڑی ہوتی ایک حدت اور قلب پر ملنے والی کیفیت ہوتی۔ پھر بھی اس کی ظاہری شکل و صورت میں کوئی بہتری نہ آئی تھی، وہ پہلے ہی سا مفلوک الحال قسم کا شخص نظر آتا تھا۔ جس کا جگر خراب ہو اور جسے اس کی غذا راس نہ آتی ہو۔۔۔۔۔۔

میرے وہاں جانے کا وقت کبھی اس کے بعد ا اور اس سے مجھے معلوم ہوا کہ رضیہ چھ بجے شام سے پہلے شاذونادر ہی بالکنی پر آکر ٹھہرتی ہے یہ قابل فہم تھا کیونکہ چھ بجے شام کچھ اندھیرا ہو جاتا ہے اور اس کی خالہ اس پر کڑی نگرانی رکھتی تھی اور پھر وہ دن میں اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہو گی۔۔۔

جب وہ بالکنی پر ہوتی اور ہم ٹاٹ کے شگاف کے پیچھے اس کی مرمریں سفیدی سے آگاہ ہو جاتے، ہم اس کی طرف سیدھی نگاہوں سے کبھی نہ دیکھتے کہ کہیں وہ پریشان نہ ہو جائے، کہیں وہ بوکھلا نہ جائے۔ کنار کی نظریں تو فوراً ڈکشنری میں گڑ جاتیں اور وہ عجیب طور پر ہوشیار اور نروس سا ہو جاتا (شاید اس نے اسے اب تک اچھی طرح نظر بھر کر نہ دیکھا تھا)۔۔۔۔۔ میں اس طرح ظاہر کرتا جیسا کہ میں اس کی ٹاٹ کے پیچھے موجودگی سے آگاہ نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔ ایک دفعہ میں نے ویسے نظر بھر کر اس کی بالکنی کی طرف دیکھا۔ وہاں وہ کھڑی تھی ـــــ شام کے گہرے جھٹپٹے میں ایک عجیب طور سے دل غلاتی ہوئی دیوی سی اور اس کی آنکھیں ہم پر گڑی ہوئی تھیں ـــــ اپنے اندر اندر اتھاہ تمنا اور محبت لئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ میرے اوپر دیکھنے پر اس کی نگاہیں نیچی ہوگئیں اور اس نے اپنا منہ ایک طرف پھیر لیا۔ مگر وہ چلی نہیں گئی۔۔۔۔۔ اور ایک دفعہ جب بالکنی چاندنی میں دھلی ہوئی تھی (چاند چاکی واڑا پر بھی چمکتا ہے) میں نے اس کی سفید شکل کو ایک بالکنی کے جنگلے کے ساتھ سہارا لئے ہوئے دیکھا وہ ہماری طرف۔ ایک عجیب

یاس انگیز خوابیدہ نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا مرمریں ہاتھ اس کے سیاہ بالوں کے سر کو تھامے تھا۔ اس کا سارا جسم پتلے چوبی جنگلے کے ساتھ ساتھ لہلاتے ہوئے تھا۔ کتنی بے خود اور قاتل وہ شب نظر آتی تھی۔ وہ مجھے ایک اطالوی پینٹر کی تصویر کی طرح لگی جس نے مجھے کالج کے ایام میں کئی بار متوجہ کیا تھا۔

کنار کو ایک اطمینان یہ تھا کہ فغفور اب اس کے کمرے میں وقت بے وقت نہیں آتا تھا۔ پروفیسر شاہسوار کی مداخلت اور بیچ بچاؤ کے بعد وہ منحوس جن اپنی حرکت سے باز آ گیا تھا۔۔۔ اس عرصہ میں کنار نے مجھ سے کئی بار پچیس روپے آنہ آنے کا تقاضا کیا۔ میں یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ جب پروفیسر نے اس کی بھیڑ تنبیہہ کی تو دیکھا جائے گا۔

ایک شام جب میں کنار کے فلیٹ پر پہنچا تو میں نے اسے معمول سے زیادہ مضطرب پایا، اس آدمی کی مانند جو کسی حیرت ناک واقعہ کے کنارے پر کھڑا ہو، اپنی اضطرابی کیفیت پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ کبھی مسافر سے کھیلنے اور باتیں کرنے لگ جاتا اور اس دوران میں مجھے چراتی ہوئی بے رنگ آنکھوں سے دیکھتا۔ ظاہر تھا کہ کوئی نیا خیال اس کے دماغ میں ہے کوئی نئی پلین۔۔۔۔ اور وہ مجھ سے اس کا ذکر کرنے میں جھجک رہا ہے۔

آخر اس نے اپنی جھجک پر قابو پاتے ہوئے کہا، "چنگیزی یار! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی وہ کر سکتی ہے۔ آج دوپہر کو اس کی خالہ نے اسے قید کر رکھا ہے۔ میں کل اس کو یہاں ہمیشہ کے لئے اپنے پاس بلا لوں گا۔"

"خالہ کو" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میرا مطلب محبوب سے ہے۔ رضیہ سے۔ دس ہزار ظالم اور کمینہ ور خالائیں اس کو یہاں آنے سے نہیں روک سکیتں۔ وہ میرے پاس اس طرح کھنچی ہوئی آئے گی

جیسے لوہا مقناطیس کی طرف، بھونرا پھول کی طرف..... اور جیسے شمع پر والے کی طرف۔"

"تمہارا مطلب ہے جیسے پروانہ شمع کی طرف۔"

"میں نے بھی یہی کہا تھا۔ بہر حال اگر میں نے اس کے اُلٹ کہا ہو تو تم کو یاد رکھنا چاہیے چنگیزی، کہ میں اس وقت جذبات کے عجیب دباؤ کے تحت بول رہا ہوں۔"

تم یہ کیسے کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"کیسے!" وہ بولا "چنگیزی! بعض دفعہ تو تم بے حد سادہ لوحی کی باتیں کرتے ہو۔ کیا میرے پاس پروفیسر شاہسوار کی طلسمی انگوٹھی نہیں؟ میری حضرت سلیمان کو عرض کرنے کی دیر ہے اور وہ خود بخود یہاں میرے پاس چلی آئے گی۔ دس ہزار خلائیں سے۔"

"دس ہزار خلائیں والی بات تو ٹھیک ہے،" میں نے کہا "مگر میری رائے میں اگر وہ یہاں آ بھی جائے تو تم اس کو کیسے چھپاؤ گے۔ تم پر اغوا کا مقدمہ چل سکتا ہے....."

"میں نے یہ سب کچھ سوچ لیا ہے،" کٹار بولا "پرسوں صبح ہی ہم یہاں سے لاہور چلے جائیں گے میں نے غالباً تم کو بتایا نہیں۔ چار دن ہوئے مجھے وہاں کی ایک فلم کمپنی نے ملازمت کی پیش کش کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی بننے والی فلموں کے لئے افسانے اور مکالمے لکھوں وہ میرے ایک ناول کی کہانی فلمانا چاہتے ہیں۔ بے نشل جمگادڑ اور ظلمات کے حقوق کی قیمت کی پیشگی کے طور پر انہوں نے مجھے ڈھائی سو روپے کا چیک بھی بھیجا ہے۔"

"تم نے مجھے اس کا ذکر نہیں کیا؟ کٹار،" میں نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا۔

"میں نے ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا کہ اس عقیدت اور شیفتگی کی وجہ سے جو تم کو میری ذات سے ہے، مجھ سے بچھڑنے پر تم کو بے حد صدمہ ہوگا۔ میں نے یہ خبر آخری وقت کے لیے رکھی ہوئی تھی..... نہیں چنگیزی یار! فکر مت کرو۔ میرا کہا سنا معاف کر دینا۔ آدمی سے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ لاہور اگر کبھی تمہارا آنا ہو۔ تو فضلی برادرز کے سٹوڈیو میں

ایکسپریس پر لاہور جائیں گے۔ انگوٹھی نے ابھی اپنی یہ کرامت کر کے دکھائی تھی۔ پروفیسر شاہسوار خاں کا پر جلال غضب ناک چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ تم پھر شک کرتے ہو۔ اچھا تم دیکھ لو گے!"

کٹار کہہ رہا تھا۔ "اچھا چنگیزی یار! وہ عرض داشت کا مسودہ پھر تیار کر دو۔ میں اس کو اب کے زبانی یاد کر لوں گا۔ انگوٹھی پر عمل کے وقت بیک وقت انگوٹھی میں دیکھنا اور نیچے لکھی ہوئی چیز کو پڑھنا ممکن نہیں۔"

"ہاں" میں نے اس طرح کہا جیسے خواب کے عالم میں ہوں۔

میں نے پھر وہ عرضداشت کا مسودہ تیار کیا، مگر میرا دھیان کہیں اور تھا۔ میرا دل خدا جانے کیوں بیٹھ رہا تھا! قسمت کی اٹل ناگزیریت سے میں دوچار ہو رہا تھا۔ میرے دماغ کے پردے پر سینا کی فلم کی طرح گڈمڈ، پروفیسر شاہسواروں کے پر جلال مسجع چہرے، رضیہ کے معصوم دربار رخ پھڑکتے اور بجھتے ہوئے تیز رفتاری سے گزرنے لگے۔ ایک ریل گاڑی گزرنے لگی۔ کوکو۔ چھک چھک۔ قربان علی کٹار سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے دروازہ میں کھڑا رومال ہلا رہا تھا۔ "خط لکھتے رہنا" وہ کہہ رہا تھا۔ کوکو۔ چھک! چھک! چھک!!

جب میں عرضداشت کے الفاظ گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کٹار غالباً کہہ رہا تھا۔ "تعجب کی بات ہے نہ مجھے اور نہ ہی تمہیں اس بات کا خیال آیا — اس انگوٹھی کی کرامت سے تو روٹھا ہوا محبوب بھی قدموں میں آ گرتا ہے اور یہ محبوب نور رضامند ہے مکمل طور پر رضا مند! — کل صبح ہی سیٹیں بک کرا لینا۔"

غرض اس دفعہ نے عرضداشت مختصر ہی رکھی۔ دراصل میری ایجادی اور ادبی قوتیں بنجر ہو گئی تھیں۔ حضرت سلیمان کے استفادہ کے لئے کٹار کی محبت کی مختصر تاریخ دینے کے بعد ان سے گزارش ان الفاظ میں کی گئی تھی "یور ایکسیلنسی! میری خواہش ہے کہ میرا محبوب اسی وقت میرے بازوؤں میں آ جائے۔"

کنار نے اس کو پسند کیا۔ اگرچہ مجھے خوف تھا کہ یہ الفاظ شاید سلیمان شاہ کی اخلاقی عادات کو دھچکا نہ پہنچا ہیں۔ کنار کا ان کو پسند کرنا واقعی ایک تعجب کی بات تھی۔ میرا خیال نہ تھا کہ اس کو اس حوصلہ سے متصف کیا جا سکتا تھا جو ایک عورت کو بازوؤں میں لینے کے لئے درکار تھا۔ اس جیسے بزدل شخص میں یہ ہمت! یقیناً دنیا اُلٹ سلٹ ہو رہی تھی۔

ہاں ہم کوئی ایک بجے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے بیتے ہوئے سنہری دنوں کی باتیں جن سے میرا یہ تاثر پختہ ہو گیا کہ کنار واقعی جا رہا ہے۔ . . . اس شام رضیہ بالکنی پر بالکل نہ آئی جس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو اس پر نگرانی کڑی کر دی گئی ہے اور یا وہ کسی کونے میں دبکی ہوئی اپنی خالہ کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہی ہے۔ کنار کی رائے میں وہ بھڑاس نکال رہی تھی۔

جب میں کنار سے رخصت ہوا وہ مجھے نیچے بیرٹ جیبوں تک چھوڑنے آیا۔ یہ بات وہ شاذ و نادر ہی کرتا ہے مگر اس رات ہم نے وہ محبت اور وفا کے پوشیدہ سوتے دریافت کئے تھے جو ہم دونوں کے سینوں میں ایک دوسرے کے لئے اُبل رہے تھے اور مفارقت کے خیال نے ہماری باہمی سچی یاری کو پھر تازہ کر دیا تھا جو پچھلی غلط فہمیوں اور اُدھاروں وغیرہ کی وجہ سے کچھ بوسیدہ ہو گئی تھی۔ گلی میں آ کر اس نے مجھے سیٹیں بک کرانے کے بارے میں پھر تاکید کی۔ ــــ

دوسری صبح میں کتنا مضطرب تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مجھے اپنی صبح کی معمولی ورزش اور مالش وغیرہ کا بھی ناغہ کرنا پڑا۔ میں کمار کے لئے سیٹیں بک کرانا بھی بھول گیا۔ کمار دوپہر کے کھانے پر آیا اور میں نے اس دفعہ اس کی اسی شوق اور انبساط سے خاطر داری کی جیسے اس روز کی تھی جب وہ پہلے پہل ہی زندگی میں آیا تھا۔ اللہ توکل کی بہترین ڈشیں، اس کے سامنے چنی گئیں اور بلیک اینڈ وائٹ کا ایک نیا ٹن خاص اس کے لئے کھولا گیا۔ وہ بے حد خوش معلوم ہوتا تھا اور زیادہ عرصہ مجھ سے اور شداد پشمی سے سٹوڈی بیکر اور پیکارڈ کی متقابل خوبیوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اس کو مشورہ دیں کہ کونسی کار اس کی نئی اہمیت کی زندگی میں اس کے شایان شان ہو سکتی ہے۔ روپیہ، وہ مصر تھا، کوئی امر مانع نہیں تھا۔ وہ بہترین اور نفیس ترین چیز چاہتا تھا۔ کیونکہ میں اور شداد پشمی کاروں کے متعلق زیادہ نہیں جانتے تھے، اس لئے اسے کوئی کارآمد مشورہ نہ دے سکے اس مسئلہ پر۔ اس کے بعد وہ چلا گیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اسے دھوبی سے کپڑے لینے تھے۔ اس نے مجھ سے بتیس روپے ادھار لئے۔ اس نے دوہرایا کہ وہ مجھے فصلی بٹڑوں کا چیک دے رہا ہے اور فلیٹ بھی — اس نے کہا کہ تم چاہو تو ابھی سے قبضہ کی خاطر اپنا کچھ سامان وہاں بھیج دو۔

شام کو جب میں مڈل وسے اسٹریٹ میں گیا تو ڈوبتے ہوئے سورج کی زردی پتھریلے مکانوں سے چمٹی ہوئی تھی اور اسٹریٹ تقریباً خوبصورت اور رومانٹک لگ رہی تھی۔ آسیبیت

اب بھی تھی مگر یہ ایک مختلف قسم کی آسیبیت تھی عمارتیں ایسی لگتی تھیں گویا کہ وہ گلاب کی نازک پتیوں سے بنی ہوئی ہوں میں اضطراب کی وجہ سے اللہ توکل سے ذرا جلدی چلا آیا تھا۔کٹار والے مینشن پر پہنچ کر میں رکا۔میں اس کو اوپر کھڑکی کے سامنے آرام کرسی میں دراز دیکھ سکتا تھا۔۔۔۔

کیوں نہ میں رضیہ کی خالہ سے گھڑی دو گھڑی کے لئے مل آؤں مجھے وہاں گئے اب چار روز ہو چکے تھے اور پھر مجھے کئی باتوں کے بارے میں استعجاب سا تھا۔شاید یہ میرا وہاں رضیہ کی موجودگی میں آخری بار جانا ہوگا۔زینہ چڑھ کر میں نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔کچھ عرصہ تک کوئی نہ بولا۔پھر ایک ڈری ہوئی سی آواز آئی کون ہے؟"

"چچی رابعہ ہیں" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔میں جانتا تھا کہ دروازے کے پٹ کے پیچھے میری مخاطب کون تھی۔

"نہیں" اس نے کہا "وہ مالیر اپنی ایک رشتہ دار سے ملنے گئی ہیں اور کہیں شام کو لوٹیں گی"

اس نے مری آئی ڈینٹٹی کو جان لیا تھا اور اس نے یہ نہ پوچھا کہ میں کون ہوں۔

"آپ ۔۔۔۔" وہ بولی مگر اس نے فقرہ کو ختم نہ کیا۔

"ہاں فرمایئے" میں نے کہا۔

"آپ اتنے دن نہیں آئے" اس نے پوچھا۔

"کچھ مصروفیت ایسی رہی ۔۔۔۔۔"

"روز تو آپ سامنے کے فلیٹ میں قربان علی کٹار صاحب کے پاس آتے ہیں" رضیہ کھل رہی تھی۔اگر میں چاہتا تو میں وہاں کافی دیر کھڑا باتیں کر سکتا تھا مگر دوسری فلیٹوں کے رہنے والے یہاں سے اوپر نیچے گزر رہے تھے۔کنٹوپ والا شخص سلیپر پہنے اوپر زینے کے جنگلے سے جھانک کر ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اچھا" ۔۔۔ میں نے کہا۔

"آپ ۔۔۔۔" مگر میں نیچے سیڑھیوں سے اُتر آیا، ان سب فلیٹ والوں کو (ماسوا رضیہ)

کے کوسنا ہوا جو اس حویلی میں رہتے تھے اور خصوصاً کنٹوپ والے بے ہودہ شخص کو.... اس کی خالہ دس بجے سے پہلے نہ آئے گی۔ لڑکی رضیہ اکیلی تھی...... یہ بات طلسمی انگوٹھی کے موجد کے حق میں تھی۔ کون کہہ سکتا ہے! کون کہہ سکتا ہے!

کٹار خموش تھا اور اس کے ساتھ ہی کچھ ہراساں بھی اور اس کی انگلیوں میں ایک کپکپاہٹ سی تھی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس وغیرہ باندھ کر ایک کونے میں رکھا ہوا تھا اور وہ میرے بہترین سوٹ میں ملبوس تھا اس کے بٹن ہول میں ایک بڑا سرخ گیندے کا پھول تھا۔

اس نے مجھے وہ چیک جیب میں سے نکال کر دیا۔ یہ واقعی فصلی بٹیروں کا امپریل بنک کراچی کے نام ایک کراس چیک تھا مگر اس کی تاریخ جب کہ اسے کیش کرایا جا سکتا تھا آگے کی تھی ظاہراً ابھی تک فصلی بٹیروں کا حساب امپریل بنک کی کراچی برانچ میں ٹرانسفر نہ ہوا تھا اور اس لئے انہوں نے آگے کی وہ تاریخ دی تھی جس وقت تک ان کا خیال ہوگا کہ ان کا اکاؤنٹ ٹرانسفر ہو جائے گا۔ ویسے یہ ایک حقیقی چیک تھا۔ شیخ قربان علی کٹار کے قدر دان اب بھی موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ غالباً فصلی بٹیروں کا ڈائریکٹر یا پروڈیوسر کالج کے دنوں میں کٹار فین ہوگا۔

کٹار نے کہا، "یہ ہے چیک۔ ڈھائی سو روپے کا در اصل چنگیزی یہ سب پروفیسر شاہسوار خاں کی نظر عنایت کا نتیجہ ہے۔ جب سے پروفیسر مجھے اس شام ملا میں محسوس کرنے لگ گیا کہ میری زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے اور اچھے دن آرہے ہیں۔ یہ دیکھو۔ روپیہ ڈھائی سو روپے۔ اپنی شہرت کے چمکیلے ترین دنوں میں بھی میں نے اتنی رقم کا چیک نہیں دیکھا۔ مجھے ایک عمدہ ملازمت مل رہی ہے۔ جہاں سے ترقی کر کے میں ڈائرکٹر اور پروڈیوسر وغیرہ بن سکتا ہوں۔ قابلیت کہیں چھپی نہیں رہتی اور آج رات کو مجھے اپنے محبوب کا وصال بھی مہیا ہو جائے گا۔ پروفیسر شاہسوار خان واقعی ایک قطب اور ولی اللہ ہے۔ ہاں بھئی چنگیزی

وہ پروفیسر کے پچیس روپے تو منی آرڈر ہی نہیں کئے۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ ایک دن اور انتظار کر سکتا ہے، اور روپیہ سے کل ضرور منی آرڈر کردیا جائے گا۔

"جونہی وہ یہاں آئے گی،" کثار نے اپنے ناولوں کے سے تقریباً ہیروؤں والی خود اعتمادی سے کہا "ہم یہاں سے تمہارے ہوٹل میں چلے جائیں گے اور وہاں سے صبح ایکسپریس پر جا چڑھیں گے۔ میرے خیال میں کراچی چھاؤنی سے سوار ہونا بہتر ہوگا۔"

کھڑکی میں سے دیکھتے ہوئے میں نے رضیہ کو اپنی بالکنی پر سے کھڑے ہماری طرف بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کا دوپٹہ اس کے سر پر نہ تھا، اس کا سینہ اس کی سفید قمیص میں متلاطم تھا اور اس کے چہرے پر (مجھے ایسا معلوم ہوا) ایک من چلی سی، جان پر کھیل جانے کی سی نظر میں نے بوکھلا کر نظریں نیچی کرلیں اور جب میں نے پھر اس طرف دیکھا وہ بالکنی پر نہ تھی اور اس کی فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔

کچھ دیر میں اور کثار ایک دوسرے کو خاموش بیٹھے دیکھا کئے۔ پھر کثار نے کہا "تم نے اسے دیکھا؟"

یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کثار اپنی کوتاہ نظری کے باوجود اس کو کیسے دیکھ لیتا تھا۔ کوتاہ نظری کے باوجود اور اس کے باوجود کہ وہ بھی اس طرف بھرپور نگاہ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ پھر بھی جب بھی وہ بالکنی پر ہوتی، کثار اس کی موجودگی سے آگاہ ہو جاتا اور یہ آگاہی ایک عجیب اعصابیت اور کانوں کی لوؤں کی سرخی کی شکل میں اس میں نمودار ہو جاتی۔

کمرے میں اب اندھیرا ہو رہا تھا۔ کثار نے مجھے بجلی سوئچ آن کرنے کے لئے کہا۔

میں نے بٹن دبایا۔ بغیر کسی نتیجہ کے۔

"آج کیا دن ہے" کثار نے پوچھا۔

"جمعرات"

"اوہ! آج یہاں گیارہ بجے سے پہلے بجلی نہ آئے گی۔"

ہر ایک جانتا ہے کہ پاور پلانٹ میں چھ ماہ سے ایک بائلر پھٹ جانے سے (جس کی مرمت ہو رہی تھی) ہفتہ میں ایک ایک روز کراچی کے ہر ایک 'ایریا' کو تاریکی میں رہنا پڑتا ہے آج پاکی واڑا کی باری تھی۔ یہ قدرت کے ان اٹل قانونوں میں سے ایک تھا جس کے آگے سر تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

کٹار کے پاس موم بتیاں نہ تھیں، عموماً اسے فلیٹ میں رات کو روشنی کی زیادہ ضرورت بھی نہ پڑتی تھی اور جمعرات کو وہ اکثر بجلی کے آجانے تک، میرے ہاں اللہ توکل، ہی میں رہتا۔ اب وہ کھڑکی کے پاس گیا اور باہر دھندلکے سے اس نے اپنی کلائی پہ گھڑی میں وقت دیکھا۔

"آٹھ بیں چار منٹ۔ چنگیزی یار" اس نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا، مگر وہ غسل خانے میں وضو کرنے چلا گیا۔ نیچے گلی تاریک اور سنسان پڑی ہوئی تھی کسی متنفس کے بغیر، سامنے کے فلیٹ کے کواڑ ٹاٹوں کے پیچھے بالکل بند تھے اور روشنی کی ایک درز بھی وہاں نہ تھی۔ کٹار وضو کرنے کے بعد کمرہ سے باہر کچھ دیر کے لئے گیا جہاں وہ ایک گیلے رومال سے اپنی نام کی تختی کو پونچھنے اور صاف کرنے لگا یہاں تک کہ سفید حروف کچھ دمکنے لگے ـــــ پھر وہ اندر آیا۔

"دیکھا خدا نے آج مصلحت کی بنا پہ اندھیرا کر دیا ہے۔ تاکہ کوئی آتا اور جاتا دکھائی نہ دے۔"

میں جانتا تھا اس کا کوئی سے کیا مطلب تھا، تاہم مجھے آج بجلی کے نہ ہونے میں اسرار سا نظر آیا۔ قسمتیں میدان تیار کر رہی تھیں۔

آٹھ بجے کٹار اپنی کرسی پہ قبلہ رو بیٹھا انگوٹھی کو انگلیوں میں پکڑے نگینہ میں دیکھ رہا تھا۔ میں سامنے دوسری کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اور اس کی لمبی دبلی نیم دراز شکل مجھے کچھ کچھ آسیبی سی نظر آ رہی تھی۔

میرے خدا! کیا وہ آئے گی! کیا وہ آئے گی۔! اس کی خالہ یہاں نہ تھی، مکمل اندھیرا تھا اور وہ بے دھڑکی اور مجھے کسی کی کیا پرواہ، والی نظر!

دس منٹ تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔ اور میں اپنے دل کی دھڑکن کو سُن سکتا تھا۔ ' خاکروب جھاڑو دو، کٹار کی دھیمی مرتعش سی آواز آئی، صاف ــ اور ہوا آتی جیسے کوئی بدروح اس تاریک کمرہ میں بول رہا ہو۔

" فرش بچھاؤ" پھر ایک دھیمی مرتعش آواز سناٹے میں سے آئی، سرگوشی کی طرح جو مبہم کمرے کی پہنائیوں میں سے۔ خاکروب کے جھاڑو دینے سے سلیمان بادشاہ کے آنے تک ایک لمبا عرصہ گزرتا ہوا معلوم ہوا اور جوں جوں اس کی آمد کے ابتدائی لوازمات ترتیب سے مکمل ہوتے جاتے، میری دھڑکن تیز تر ہوتی جاتی۔

قربان علی کٹار کے اضطراب کا اس سے پتہ ملتا کہ اس کا ہر اگلا حکم زیادہ مبہم زیادہ سرگوشیانہ سا ہوتا جیسے ان الفاظ کو نکالنے والا ہذیانی خوف کی گرفت میں ہو۔......

اور آخر۔ وہ لمحہ آگیا۔

تھوڑی خاموشی جس میں میں کٹار کی کلائی کی گھڑی کی ٹک ٹک سُن سکتا تھا! پھر کٹار کی آواز آئی۔ قسمت کی آواز کی طرح اُونچی مگر پھر بھی کچھ بھرائی ہوئی اور بعض لفظوں پر ٹوٹی ہوئی " حضرت سلیمان بادشاہ ۔ میرا محبوب اب تمہارے حکم سے میرے بازوؤں میں ہو۔ "

سناٹا۔ اور آدھ منٹ تک ہم دم سادھے بیٹھے رہے ــــ پھر فی الواقع نیچے زینہ پر کسی کے دبے قدموں سے اوپر چڑھنے کی آواز آئی۔ وہ آ رہی تھی! آ رہی تھی! ــ میرے پیچھے دروازہ پر کوئی قدم آکر رُکے کسی نے دروازہ کھولا ــــ خدا جانے کیوں میں نے آنکھیں بند کر لیں ــــ کمرے کے اندر کوئی تھا۔

اُس وقت بجلی آگئی۔ میں نے دھپ دھپ کرتے دل کے ساتھ آنکھیں کھولیں —— کنارِ نیم دراز، آنکھیں موندے اور ایک سرشاری کی کیفیت اپنے چہرے پر لئے آرام کرسی میں لیٹا تھا۔ اور اس کے بازو پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہوئے مسافر، کے گرد حائل تھے۔!

چاکیواڑہ میں وصال

کھویا ہوا اُفق

مکاتیب خضر

ابن جبیر کا سفر

Rs. 150.00